وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ

زیر سرپرستی
مولانا امین احسن اصلاحی

ماہنامہ
# میثاق
لاہور

مدیر مسئول
اسرار احمد

| شمارہ ۶ | جون ۱۹۶۷ء | جلد ۱۳ |
|---|---|---|

## اس شمارہ میں

**تذکرہ و تبصرہ** ____ اسرار احمد ۲

**تدبر قرآن** ____ مولانا امین احسن اصلاحی

- تفسیر سورۂ نساء --- (۴) - - - - - - - - - ۲۷

**افادات فراہیؒ** ____ خالد مسعود

- اسالیب قرآن --(۲) - - - - - - - - - ۳۲

**مقالات** ____

- تعلیم اور معاشرہ ____ ڈاکٹر رضی اللہ خاں ایم اے - پی ایچ ڈی ۴۱

**خطوط و نکات** ____ اسرار احمد

- 'عجلت پسندی' اور 'حب عاجلہ' - - - - - - - - ۴۷
- 'نقض غزل' کے سلسلے میں ایک وضاحت - - - - - - ۵۱

جملہ خط کتابت اور ترسیل زر کے لئے پتہ
دارالاشاعت الاسلامیہ امرت روڈ کرشن نگر - لاہور ۱۲

## قواعد و ضوابط

*

* "میثاق" ہر ماہ کی پانچ تاریخ تک سپرد ڈاک کیا جاتا ہے۔
* پرچہ نہ ملنے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ بیس تاریخ تک دفتر کو موصول ہوجانی چاہئے ورنہ دوبارہ پرچہ ارسال نہیں کیا جا سکے گا۔

*

* ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔
* پرچہ صرف بذریعہ وی پی پی ارسال ہوگا۔
* کمیشن ۲۵ فی صد — محصولڈاک بذمہ میثاق۔

*

ہندوستانی خریدار

مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک جگہ رقوم ارسال کرکے ہمیں مطلع فرماویں:

۱ - دفتر ماہنامہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

۲ - دائرۂ حمیدیہ، سرائے میر، اعظم گڑھ

*

قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے
سالانہ زرمبادلہ ساڑھے سات روپے
مشرق پاکستان سے بذریعہ ہوائی ڈاک پندرہ روپے

اس جگہ سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس شمارے کے ساتھ آپ کا زرمبادلہ ختم ہوچکا ہے۔ آئندہ کے لئے

* سالانہ زرمبادلہ مبلغ ساڑھے سات روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمادیں ــــ یا
* اگر آپ کسی وجہ سے خریداری جاری رکھنا نہ چاہیں تو ہمیں مطلع فرمادیں ــــــــ ورنہ
* آئندہ شمارہ آپ کو سالانہ زرمبادلہ اور محصولڈاک کی مالیت کا وی پی ارسال ہوگا اور اس کو وصول کرنے کے آپ اخلاقاً ذمہ دار ہوں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# تذکرہ و تبصرہ

موجودہ دور بجا طور پر مغربی فلسفہ و فکر اور علوم و فنون کی بالادستی کا دور ہے اور آج پورے کرۂ ارض پر مغربی افکار و نظریات اور انسان اور کائنات کے بارے میں وہ تصورات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن کی ابتدا آج سے ڈیڑھ دو سو سال قبل یورپ میں ہوئی تھی اور جو اس کے بعد مسلسل مستحکم ہوتے اور پروان چڑھتے چلے گئے۔ آج کی دنیا سیاسی اعتبار سے خواہ کتنے ہی حصوں میں منقسم ہو تقریباً ایک ہی طرزِ فکر اور نقطۂ نظر پوری دنیا پر حکمران ہے اور بعض سطحی اور غیر اہم اختلافات سے قطع نظر ایک ہی تہذیب اور ایک ہی تمدن کا سکہ پوری دنیا میں رواں ہے۔ کہیں کہیں منتشر طور پر کوئی دوسرا نقطۂ نظر اور طرزِ فکر اگر پایا بھی جاتا ہے تو اس کی حیثیت زندگی کی اصل شاہراہ سے ہٹی ہوئی پگڈنڈی سے زیادہ نہیں ہے ورنہ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ جو طبقے قیادت و سیادت کے مالک ہیں اور جن کے ہاتھوں میں اجتماعی زندگی اور اس کے جملہ متضمنات کی اصل زمامِ کار ہے وہ سب کے سب بلا استثناء ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ مغربی تہذیب و تمدن اور فلسفہ و فکر کا یہ تسلط اس قدر شدید اور ہمہ گیر ہے کہ بعض ان قوتوں کے نقطۂ نظر کا جائزہ بھی اگر دقتِ نظر سے لیا جائے جو مختلف ممالک میں مغربی تہذیب و تمدن کے خلاف صف آرا ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی مغرب کے اثرات سے بالکلیہ محفوظ نہیں ہیں اور خود ان کا طرزِ فکر بہت حد تک مغربی ہے۔!

تہذیبِ جدید کی بنیاد میں جو فکر کام کر رہا ہے وہ نہ تو کوئی ایک دن میں پیدا ہو گیا ہے اور نہ ہی کوئی سادہ اور بسیط شئی ہے بلکہ ان ڈیڑھ دو سو سالوں کے دوران فلسفے کے کتنے ہی مکاتبِ فکر یورپ میں پیدا ہوئے اور کتنے ہی زاویہ ہائے نگاہ سے انسانوں نے انسان اور انسانی زندگی پر غور و فکر کیا ــــ لیکن اس پورے ذہنی و فکری سفر کے دوران ایک نقطۂ نظر جو مسلسل پختہ ہوتا چلا گیا اور جسے بجا طور پر اس پورے فکر کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں خیالی اور ماورائی تصورات کے بجائے ٹھوس حقائق و واقعات کو غور و فکر اور سوچ بچار کا اصل مرکز و محور ہونے کی حیثیت حاصل ہے اور خدا کے بجائے کائنات، روح کے بجائے مادہ اور موت کے بعد کسی زندگی کے تصور کے بجائے حیاتِ دنیوی کو اصل موضوعِ بحث قرار دیا گیا ہے۔ خالص علمی سطح پر تو اگرچہ یہ کہا گیا کہ ہم خدا، روح اور حیات



بعد الممات کا نہ اقرار کرتے ہیں نہ انکار لیکن اس عدمِ اقرار و انکار کا نتیجہ بہرحال یہ نکلا کہ یہ تصورات رفتہ رفتہ بالکل خارج از بحث ہوتے چلے گئے اور انسان کے سارے غور و فکر اور تحقیق و تجسس کا مرکز و محور کائنات، مادہ اور حیاتِ دنیوی بن کر رہ گئے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جن بے پناہ قوتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے وہ انہیں جس میدان میں بھی استعمال کرے نتائج بہرحال رونما ہوتے ہیں اور ہر ڈھونڈنے والا اپنے دائرۂ تحقیق و جستجو میں نئی دنیائیں تلاش کر سکتا ہے ــــ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جس طرح کائنات کی عظمت و وسعت کے اعتبار سے "مہرِ درخشاں" کی حیثیت و وقعت ایک "ذرۂ فانی" سے زیادہ نظر نہیں آتی۔ لیکن اگر ایک "ذرۂ فانی" کی حقیقت و ماہیت پر غور کیا جائے تو وہ بجائے خود "مہرِ درخشاں" کی عظمت و سطوت کا حامل نظر آتا ہے[1]۔ اسی طرح حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے چاہے خدا کے مقابلے میں کائنات، روح کے مقابلے میں مادہ اور حیاتِ اخروی کے مقابلے میں حیاتِ دنیوی کیسے ہی حقیر اور کتنے ہی بے وقعت معلوم ہوں اگر نگاہوں کو انہی پر مرکوز کر دیا جائے تو خود ان کی وسعتیں بے کراں اور گہرائیاں اتھاہ نظر آنے لگتی ہیں۔

چنانچہ یورپ میں جب "کائنات" اور "مادہ" تحقیق و جستجو کا موضوع بنے تو یکے بعد دیگرے ایسے عظیم انکشافات ہوئے اور بظاہر خفتہ و خوابیدہ مظاہرِ قدرت کے پردوں میں ایسی ایسی عظیم قوتوں اور توانائیوں کا سراغ ملا کہ عقلیں دنگ اور نگاہیں چکاچوند ہو کر رہ گئیں اور علم و فن کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو گیا ــــ قدرت کے قوانین کی مسلسل دریافت، فطرت کی قوتوں کی پیہم تسخیر اور نت نئی ایجادات و اختراعات نے ایک طرف تو یورپ کو ایک ناقابلِ شکست قوت بنا دیا اور دوسری طرف مادے کی عظمت اور اس کی قوتوں کی یہ سطوت بجائے خود اس امر کی دلیل بنتی چلی گئیں کہ اصل قابلِ التفات شئی مادہ ہے نہ کہ روح اور کائنات اور اس کے قواعد و قوانین ہیں نہ کہ خدا اور اس کی ذات و صفات! ــــ

فطرت کی ان تسخیر شدہ قوتوں سے مسلح ہو کر مغرب جب مشرق پر حملہ آور ہوا تو دیکھتے ہی دیکھتے ایک سیلاب کے مانند پورے کرۂ ارضی پر چھا گیا اور مشرقی اقوام اور ان کی عظیم حکومتیں اور سلطنتیں اس سیلاب میں ریت کے کچے گھروندوں کی طرح بہتی چلی گئیں۔ اس سیلاب کا اولین شکار چونکہ مشرقِ قریب اور مشرقِ وسطیٰ تھے جہاں مسلمان آباد تھے لہٰذا اس کی سخت ترین یورش اسلام اور اہلِ اسلام پر ہوئی اور چند ہی سالوں کے اندر اندر پورا عالمِ اسلام یورپ کے زیرِ نگیں ہو گیا۔

[1] مہرِ درخشاں نندہ فانی ــــ ذرۂ فانی مہرِ درخشاں (کوثر)

عالم اسلام پر مغرب کا یہ استیلا دوگونہ تھا ـــ یعنی عسکری و سیاسی بھی اور ذہنی و فکری بھی۔ لیکن یورپ کی اولین اور نمایاں ترین یورش چونکہ سیاسی تھی لہٰذا عالم اسلام میں جو ردِ عمل اس کے خلاف پیدا ہوا اس میں بھی اولاً اسی کا احساس غالب نظر آتا ہے۔ ملتِ اسلامی کے اس تلخ احساس نے کہ یورپ نے کہیں براہ راست تسلط اور قبضے اور کہیں انتداب و تحفظ و حمایت کے پردے میں اسے اپنا محکوم بنا لیا ہے اور اسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اس کی وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کر دیا ہے بارہا دردانگیز نالوں کی صورت اختیار کی اور اپنے شاندار ماضی کی حسرت بھری یاد، اپنی "عمر رفتہ" اور عظمت و سطوتِ گذشتہ کے بازیافت کی شدید تمنا اور گردشِ ایام کو پیچھے کی طرف لوٹانے کی بے پناہ خواہش نے کبھی سید جمال الدین افغانی کی سیماب وش شخصیت کا روپ دھارا اور کبھی تحریک خلافت کی صورت اختیار کی لیکن حقائق نے ہر بار جذبات و خواہشات کا منہ چڑایا ـــ اور مغرب کی سیاسی بالادستی رفتہ رفتہ ایک تسلیم شدہ واقعہ کی صورت اختیار کرتی چلی گئی۔

اپنے سیاسی تسلط کو مستحکم کرتے ہی یورپ نے دنیائے اسلام میں اپنے افکار و نظریات کا پرچار اور اپنے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی تبلیغ ـــ یعنی ذہنی و فکری تسخیر کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ نگاہیں مغرب کی مادی ترقی سے پہلے ہی خیرہ ہو چکی تھیں پھر زندہ قوموں میں ہمیشہ کچھ بنیادی انسانی اوصاف لازماً موجود ہوتے رہے ہیں۔ یہاں کی بنا پر مرعوبیت میں اضافہ ہوا ـــ نتیجۃً ایک مرعوب اور شکست خوردہ ذہنیت کے ساتھ مسلمانانِ عالم کے سوادِ اعظم نے مغربی افکار و نظریات کو جوں کا توں قبول کرنا اور حرزِ جاں بنانا شروع کر دیا ـــ خالص فلسفہ و عمرانیات کے میدان میں تو چونکہ خود مغرب میں بے شمار مکاتبِ فکر موجود تھے لہٰذا ان کے بارے میں تو پھر بھی کسی قدر قیل و قال اور ردّ و قدح یا کم از کم ترجیح و انتخاب کا معاملہ کیا گیا۔ لیکن سائنس چونکہ بالکل 'حتمی' اور 'قطعی' تھی اور اس کے نتائج بالکل محسوس و مشہود تھے اور اس میدان میں چون و چرا کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی لہٰذا اس کا استقبال بالکل وحیِ آسمانی کی طرح ہوا۔ اور اس کے نتیجے میں غیر شعوری طور پر ملحدانہ نقطۂ نظر اور مادہ پرستانہ طرزِ فکر رفتہ رفتہ عالم اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگوں کے ذہنوں میں سرایت کرتا چلا گیا اور خدا کے بجائے کائنات، روح کے بجائے مادے اور حیاتِ اخروی کے بجائے حیاتِ دنیوی کی اہمیت پوری امتِ مسلمہ حتیٰ کہ اس کے خاصے دیندار اور مذہبی مزاج کے لوگوں کے نزدیک بھی مسلّم ہوتی چلی گئی ـــ

مغربی فلسفہ و فکر کی اس یلغار کے مقابلے میں اسلام کی جانب سے مدافعت کی کوششیں بھی



اس دوران میں ہوئیں اور بہت سے دردمند اور دین و مذہب سے قلبی لگاؤ رکھنے والے لوگوں نے ان کے تحفظ کی سعی کی ـــ تحفظ و مدافعت کی یہ کوششیں دو طرح کی تھیں، ایک وہ جن میں محض تحفظ پر قناعت کی گئی، اور دوسری وہ جن میں مدافعت کے ساتھ ساتھ مصالحت اور کسر و انکسار کی روش اختیار کی گئی۔

پہلی قسم کی کوشش وہ تھی جسے بقول مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم اصحاب کہف کی سنت کا اتباع کہا جا سکتا ہے اور جس کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ زندگی کی شاہراہ سے ہٹ کر کونوں کھدروں میں بیٹھ جاؤ اور اپنے دین و ایمان کو بچانے کی فکر کرو۔ اس قسم کی کوششیں اگرچہ بظاہر نری فراریت کا مظہر نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت ان کی اساس خالص حقیقت پسندی اور اس اعتراف پر تھی کہ مغرب کی اس یلغار کے کھلے مقابلے کی سکت اس وقت عالم اسلام میں نہیں ہے لہٰذا ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ یہ کہ اس سیلاب کے راستے سے ہٹ جایا جائے اور ہر طرح کے طعن و استہزا کو انگیز کرتے ہوئے ایمان کی سلامتی کی فکر کی جائے، اور واقعہ یہ ہے کہ کامیابی بھی تھوڑی بہت اگر کسی کو ہوئی تو صرف اسی طریق کار کے اختیار کرنے والوں کو ہوئی اور اس کے نتیجے میں امت کے ایک حصے کا ایمان بھی سلامت رہ گیا، مادہ پرستی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روحانیت کی شمعیں بھی کہیں کہیں جلتی رہ گئیں اور قال اللہ تعالیٰ و قال الرسول کی صداؤں میں دین و شریعت کا ڈھانچہ بھی محفوظ رہ گیا ـــ! اس قسم کی کوشش کا مظہر اتم برصغیر میں دارالعلوم دیوبند تھا جو کہنے کو تو صرف ایک درس گاہ تھا لیکن واقعتہً اس کی حیثیت ایک عظیم تحریک سے کسی طرح کم نہ تھی ـــ!

دوسری قسم کی کوششوں کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ ـــ زمانے کا ساتھ بھی دیا جائے اور اسلام کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ اس مقصد کے تحت ایک طرف جدید افکار و نظریات کے صحیح و غلط اجزاء کو چھانٹ کر علیحدہ کیا جائے اور دوسری طرف اسلام کی ایسی جدید تعبیر کی جائے جس سے اس کی حقانیت ثابت ہو جائے۔ اس قسم کی کوششوں میں اوّل اوّل مرعوبیت اور شکست خوردگی کے اثرات بہت نمایاں نظر آتے ہیں چنانچہ مغرب کی عقلیت پرستی (RATIONALISM) کی کسوٹی پر ہند و مصر کے کچھ نیم متکلم قسم کے لوگوں نے اسلامی اعتقادات و ایمانیات کو پرکھنا شروع کیا۔ نتیجۃً اسلامی عقائد کی کتر بیونت اور اس کے مابعد الطبیعاتی اعتقادات کی خالص سائنٹفک توجیہیں شروع ہوئیں۔ ہندوستان میں سر سید احمد خاں مرحوم اور ان کے حلقۂ اثر کے لوگوں اور مصر کے مفتی محمد عبدہ اور ان کے تلامذہ کی نیتیں کتنی بھی نیک رہی ہوں اور انہوں نے کتنے ہی خلوص کے ساتھ اس کی کوشش

کی ہو کہ اسلام کی جدید تعبیر اور احسن توجیہ کر کے اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ زمانے کا ساتھ دے سکے اور اس کے حلقۂ بگوش اسے اپنے ساتھ لے کر ترقی کی اس راہ پر گامزن ہو سکیں جسے یورپ نے اختیار کیا تھا۔ لیکن یہ بہرحال امر واقعہ ہے کہ ان کی ان کوششوں سے دین و مذہب کی جان نکل کر رہ گئی اور مغرب کی مادہ پرستانہ ذہنیت کے تحت مذہب کا ایک خالص لا مذہبی ایڈیشن تیار ہوا جس کا اگر کوئی فائدہ ہوا تو صرف یہ کہ بہت سے ایسے لوگوں کو جو دین و فکر کے اعتبار سے ہی نہیں تہذیب و تمدن کے اعتبار سے بھی خالص یورپین بن چکے تھے، اوپر سے اسلام کا لیبل اتارنے کی ضرورت نہ پڑی اور وہ مسلم قومیت کے حلقے میں شامل رہ گئے اور دین کا یہ جدید ایڈیشن ان کی جانب سے مغرب کی خدمت میں بطور 'معذرت' پیش ہو گیا۔

جیسا کہ اس کے قبل عرض کیا جا چکا ہے، مغربی فکر کی اساس خدا، روح اور حیات بعد الممات کے عدم اقرار و انکار کے پردے میں درحقیقت انکار پر تھی۔ چنانچہ ایک طرف تو خدا کے بجائے کائنات اور روح کے بجائے مادہ تحقیق و جستجو کا مرکز و محور بنے جس کے نتیجے میں سائنسی انکشافات اور ایجادات و اختراعات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور دوسری طرف حیات اخروی سرے سے خارج از بحث ہو گئی اور حیات دنیوی گہرے غور و فکر اور شدید سوچ بچار کا موضوع بنی جس کے نتیجے میں مختلف عمرانی تصورات اور سیاسی و معاشی نظریات وجود میں آئے۔ انسان کی تالیف و تدوین سے مختلف نظام ہائے حیات پہلے علمی و فکری سطح پر اور پھر عالم واقعہ میں ظہور پذیر ہونا شروع ہوئے۔ چنانچہ ازمنہ وسطیٰ کے جاگیرداری نظام (FEUDAL SYSTEM) کے تحت جو سیاسی و معاشی ڈھانچہ عرصہ دراز سے دنیا میں رائج تھا اس کی جگہ سیاسی میدان میں قوم پرستی، آمریت اور جمہوریت کا رواج ہوا اور معاشی میدان میں سرمایہ داری اور سوشلزم برسر کار ہوئے۔ اور مختلف سیاسی و معاشی تحریکوں کا آغاز ہوا۔

عمرانیات کے میدان ہی میں مغرب کے اس فکری ارتقاء یا بالفاظ صحیح افراط و تفریط کے دھکوں کا اثر عالم اسلام پر یہ پڑا کہ یہاں بھی لوگوں نے اسلام پر بطور نظام زندگی غور و فکر شروع کیا اور اسلام نے حیات دنیوی کے مختلف شعبوں کے لئے جو ہدایات دی تھیں ان کی تالیف و ترتیب سے اسلامی نظام حیات کی تدوین ہوئی اور ساتھ ہی اس نظام زندگی کو دنیا میں عملاً نافذ کرنے کے لئے مختلف ممالک میں تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

بیسویں صدی عیسوی کی یہ اسلامی تحریکیں، جو انڈونیشیا سے مصر تک متعدد مسلمان ممالک



میں تقریباً ایک ہی وقت میں شروع ہوئیں، بہت سے پہلوؤں سے ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں اور یہ کہنا بہت حد تک صحیح ہے کہ تقریباً ایک ہی تصور دین ان کی پشت پر کام کر رہا ہے اور ایک ہی جذبہ ان میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ — پھر یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی وجہ سے عالم اسلام میں اسلام پر کم از کم ایک بہتر ضابطہ حیات ہونے کے اعتبار سے عمومی اعتماد میں اضافہ ہوا ہے۔ اور نوجوان نسل کے ذہنوں سے مغرب کی عام مرعوبیت میں بحیثیت مجموعی کمی واقع ہوئی ہے۔ مغربی فلسفہ و فکر اور تہذیب و تمدن سے مرعوبیت میں عمومی کمی کے کچھ دوسرے اسباب بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ مغرب کے سیاسی غلبے اور عسکری تسلط کا جو سیلاب تیزی سے آیا تھا وہ نہ صرف یہ کہ رک گیا ہے بلکہ مختلف ممالک میں قومی تحریکوں نے اس کا رخ پھیر دیا ہے اور مغرب اپنی سیاسی بالادستی کی بساط رفتہ رفتہ تہہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ اور اگرچہ تحفظ و حمایت کے پردے میں سیاسی بالادستی اور تعاون و امداد کے پردے میں معاشی تفوق و برتری کے بندھن ابھی باقی ہیں۔ تاہم تقریباً پورا عالم اسلام مغربی طاقتوں کی براہ راست محکومی سے آزادی حاصل کر چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ مغربی تہذیب و تمدن کا کھوکھلا پن تجربے سے ثابت ہو گیا اور خود مغرب میں محسوس کیا گیا کہ اس کی بنیاد غلط اور تعمیر کج ہے۔ خصوصاً مادہ پرستانہ الحاد جب اپنی منطقی انتہا کو پہنچا اور اس کی کوکھ سے سوشلزم اور کمیونزم نے جنم لیا اور انہوں نے انسانیت کی بچی کھچی اقدار کو بھی خالص معاشی مسئلے کے بھینٹ چڑھانا شروع کیا تو خود مغرب پریشان ہو گیا اور وہاں بھی نہ صرف انسانیت بلکہ دبی آواز میں روحانیت تک کا نام لیا جانے لگا۔ تیسرے یہ کہ ایک طرف خود سائنس کی قطعیت اور حتمیت ختم ہو گئی اور کچھ نئے نظریات نے نیوٹن کی طبعیات اور اقلیدسی ہندسے کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ — اور دوسری طرف خود مادہ ٹھوس نہ رہا اور تحلیل ہو کر قوت محض کی صورت اختیار کر گیا۔ — چنانچہ ماورا الطبیعاتی عقائد کا اقرار نسبتاً آسان ہو گیا اور مذہب کو بحیثیت مجموعی کسی قدر سہارا ملا۔ چوتھے یہ کہ مختلف مسلمان ممالک میں جب آزادی اور خود اختیاری کے حصول کے لئے قومی تحریکیں اٹھیں تو چونکہ مسلم قومیت کی اساس بہرحال مذہب پر ہے لہٰذا جذبۂ قومی کی انگیخت کیلئے لامحالہ مذہبی جذبات کو اپیل کیا گیا جس سے احیائے اسلام کے تصور کو تقویت پہنچی۔

مندرجہ بالا اسباب و عوامل سے تقویت پا کر 'احیائے اسلام' 'قیام حکومت الٰہیہ' اور 'نفاذ نظام اسلامی' کی تحریکیں مختلف مسلمان ممالک میں برسر کار ہوئیں، جن میں قوت و وسعت اور جذبہ و امنگ کے اعتبار سے مصر کی 'الاخوان المسلمون' اہم ترین تھی لیکن ایک ٹھوس اور مضبوط فکر کی حامل ہونے کے

اعتبار سے برصغیر پاک و ہند کی جماعت اسلامی کو نمایاں مقام حاصل تھا۔

یہ تحریکیں تقریباً ثلث صدی سے مختلف مسلمان ملکوں میں برسرِ عمل ہیں اور ملتِ اسلامی کی نوجوان نسل کا ایک خاصا قابلِ ذکر حصہ ان کے زیرِ اثر آیا ہے۔ لیکن عملاً ان میں سے کسی کو کوئی نمایاں کامیابی کہیں حاصل نہیں ہو سکی۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں اپنا وقت پورا کر چکی ہیں اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے خواب کی تعبیر کا ابھی وقت نہیں آیا۔ چنانچہ مصر میں الاخوان المسلمون کا اندرونِ ملک تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے اور اس کے باقیات الصالحات جلا وطنی کے عالم میں دولِ عرب کی باہمی آویزش کے سہارے جی رہے ہیں۔ رہی برصغیر کی تحریکِ اسلامی تو اس کا جزوِ اعظم پاکستانی سیاست کے نذر ہو چکا ہے اور اب اس کا مقام تحریکِ جمہوریت کی حاشیہ برداری سے زیادہ کچھ نہیں رہا۔

ان تحریکوں کی ناکامی کا سبب بظاہر تو یہ ہے کہ انہوں نے بے صبری سے کام لیا اور اپنے اپنے ملکوں میں سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی اکثریت کے ذہنوں کو بدلے بغیر سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا جس کے نتیجے میں قومی قیادتوں اور ترقی پسند عناصر سے قبل از وقت تصادم کی نوبت آ گئی لیکن درحقیقت ان کی ناکامی براہِ راست نتیجہ ہے ان کے تصورِ دین کی خامی اور مطالعۂ اسلام کے نقص کا۔

ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تحریکوں کا مطالعۂ اسلام اسی مغربی نقطۂ نظر پر مبنی ہے جس میں روح پر مادے اور حیاتِ اخروی پر حیاتِ دنیوی کو فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ اسلام کے ان ماوراء الطبیعاتی اعتقادات کا جن کے مجموعے کا نام ایمان ہے۔ اقرار تو ان کے یہاں موجود ہے لیکن انہیں کچھ زیادہ درخورِ اعتنا اور لائقِ التفات نہیں سمجھا گیا اور نگاہیں کلیتہً اس ہدایت و رہنمائی پر مرکوز رہیں جو حیاتِ دنیوی کے مختلف شعبوں کے لئے اسلام نے دی ہیں۔ اور جن کے مجموعے کا نام 'اسلامی نظامِ زندگی' رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالٰی کی ہستی کا اقرار تو موجود ہے لیکن 'ایمان باللہ' کی وہ کیفیت کہ آفاق و انفس میں تنہا وہی فاعلِ مطلق، مؤثرِ حقیقی اور مسبب الاسباب نظر آنے لگے۔ بالکل مفقود ہے ـــ آخرت کا اقرار تو کیا جاتا ہے لیکن اس پر ایسا ایمان کہ "کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل"[1] کی کیفیت پیدا ہو جائے قطعاً ناپید ہے۔ رسالت کا اقرار تو ہے لیکن محبتِ رسول نام کو موجود نہیں اور مقامِ رسالت کا تصور زیادہ ترقی پسند لوگوں کے نزدیک تو ڈاک کے ہرکارے اور صرف اپنی زندگی میں ملت کے مرکز یعنی رہبر و مطاع سے زیادہ نہیں ـــ اور جو مقامِ سنت سے زیادہ آگاہ ہیں انہوں نے بھی سنتِ عادت اور سنتِ رسالت

[1] حدیث نبوی صلعم: دنیا میں ایسے رہو جیسے اجنبی یا مسافر۔



کی تقسیم سے ایسا چور دروازہ پیدا کر لیا ہے، جس سے کم از کم اپنی نجی زندگیوں کی حد تک زمانے کا ساتھ دینے کی آزادی برقرار رہے! گویا 'ایمان' کا صرف وہ اقرار پایا جاتا ہے جو قانونی اسلام کی بنیاد ہے اور یہ کیفیت کہ ایمان انسان کا حال بن جائے نہ صرف یہ کہ موجود نہیں ہے بلکہ اس کی کسی ضرورت و اہمیت کا احساس بھی سرے سے عنقا ہے ـــ!

اسی نقطۂ نظر کا کرشمہ ہے کہ دین اسٹیٹ (STATE) کا ہم معنی قرار پایا ہے اور عبادت اطاعت کے مترادف ہو کر رہ گئی ہے۔ نماز کا یہ مقام کہ وہ معراج المومنین[1] ہے۔ نگاہوں سے بالکل اوجھل ہے اور نفسِ انسانی کا اس سے ایسا اُنس کہ قرۃ عینی فی الصلوٰۃ[2] کی کیفیت پیدا ہو سکے۔ ناپید ہے۔ اس کے برعکس زیادہ ترقی پسند لوگوں کے نزدیک تو صلوٰۃ معاشرے کے ہم معنی قرار پائی ہے اور دوسروں کے نزدیک بھی اس کی اصل اہمیت اس حیثیت سے ہے کہ وہ مسلمان معاشرے کی اصلاح اور تنظیم کا ایک جامع پروگرام ہے۔ زکوٰۃ کا یہ پہلو کہ یہ روح کی پاکیزگی اور تزکیے کا ذریعہ ہے اس قدر معروف نہیں جتنی اس کی یہ حیثیت کہ یہ اسلامی نظامِ معیشت کا اہم ستون ہے۔ روزہ کے بارے میں یہ تو خوب بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ضبطِ نفس (SELF CONTROL) کی مشق و ریاضت ہے۔ لیکن اس کی اس حقیقت کا یا تو سرے سے ادراک ہی نہیں ہے یا اس کے بیان میں حجاب محسوس ہوتا ہے کہ یہ روح کی تقویت کا سامان اور جسدِ حیوانی کی اس پر گرفت کو کمزور کرنے کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ یہ حدیث تو تحریر و تقریر میں عام بیان ہوتی ہے کہ "الصوم جُنّۃ"[3] لیکن یہ حدیثِ قدسی کہ "الصوم لی و انا اجزی بہ"[4] نہ تحریر میں آتی ہے نہ تقریر میں۔ اسی طرح حج کے بارے میں یہ تو معلوم ہے کہ اس کے ذریعے خدا پرستی کے محور پر ایک عالمگیر برادری کی تنظیم ہوتی رہے لیکن اس سے آگے اس کی روحانی برکات کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا ـــ!

اسلام کی یہ نئی تعبیر براہِ راست نتیجہ ہے مغرب کے فلسفہ و فکر کے ہمہ گیر تسلط کا جس نے نقطۂ نظر کو ملحدانہ و مادہ پرستانہ بنا کر رکھ دیا۔ نتیجۃً روح اور اس کی حیاتِ باطنی خارج از بحث ہو گئے۔ اور مادہ اور حیاتِ دنیوی ہی سارے غور و فکر کا موضوع اور سعی و جہد کا مرکز بنے۔ چنانچہ دین و مذہب کی بھی

[1] حدیث نبوی صلعم: الصلوٰۃ معراج المومنین: نماز مومنوں کی معراج ہے! [2] حدیث نبوی صلعم: میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے! [3] حدیث نبوی صلعم: "روزہ ڈھال کے مانند ہے" [4] حدیث قدسی: "روزہ میرے لئے ہے میں خود اس کی جزا دوں گا" یا ایک دوسری قرأت کے مطابق: "روزہ میرے لئے ہے اور میں خود ہی اس کی جزا ہوں"۔

مادی تعبیر ہوئی اور کہنے میں تو اگرچہ یہ آیا کہ اسلام فلاحِ انسانی کا جامع پروگرام ہے جس میں فلاحِ اخروی اور فلاحِ دنیوی دونوں شامل ہیں۔ لیکن نگاہیں چونکہ فی الواقع صرف حیاتِ دنیوی پر مرکوز ہیں، لہٰذا آخری تجزیے میں اسلام ایک "سیاسی و عمرانی نظام" (POLITICO-SOCIAL SISTEM) بن کر رہ گیا۔۔۔ اور "الٰہیات" کی حیثیت ایک "پردے" سے زیادہ نہ رہی ۔۔۔ چنانچہ زندگی کا اصل مقصد یہ قرار پایا کہ اس نظامِ زندگی کو عملاً رائج و نافذ کیا جائے۔ رہی خدا کی معرفت و محبت اور اس کے سامنے تضرع و اخبات جو عبادت کا اصل جوہر ہیں تو ان کی حیثیت بالکل ثانوی و ضمنی ہو کر رہ گئی!

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں فی الواقع مذہبی سے زیادہ سیاسی و عمرانی اور دینی سے زیادہ دنیوی ہیں، اور آخری تجزیے میں یہ دوسری سیاسی و معاشی تحریکوں سے صرف اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ ان کے نزدیک سرمایہ دارانہ جمہوریت یا اشتراکیت بہتر نظام ہائے حیات ہیں اور ان کے نزدیک اسلام انسانی زندگی کے جملہ مسائل کو بہتر طور پر حل کرتا ہے ۔۔۔ گویا درحقیقت مذہب کی اصل اقدار کے احیاء کا کام تو ابھی شروع بھی نہیں ہوا ۔

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

یہی سبب ہے کہ یہ تحریکیں بے لنگر کے جہازوں کے مانند ادھر ادھر بھٹک رہی ہیں اور ان کا حال اکثر و بیشتر اس مسافر کا سا ہے جسے نہ تو منزل ہی کا پتہ رہا اور نہ یہ ہی یاد رہا کہ سفر شروع کہاں سے کیا تھا ۔

ہم تو فانی جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

یہ صورتِ حال بھی خاصی غنیمت ہے، بر سرِ اسلامی تحریکوں کے یہاں ہے ۔۔۔ مدعیان زیادہ ترقی پسند لوگوں نے تو فکرِ مغرب کی منطقی انتہا یعنی سوشلزم اور کمیونزم کے زیرِ اثر اسلام کو سیاسی و عمرانی سے بھی آگے بڑھ کر محض ایک معاشی پروگرام بنا کر رکھ دیا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک اسلام عبارت ہے محض ایک مخصوص "نظامِ ربوبیت" سے، باقی رہے اعتقادات و ایمانیات تو ان کے ضمن میں جہاں سرسید مرحوم کی انتہا ہوئی تھی وہاں سے انہوں نے ابتدا کی اور جنت و دوزخ کی تعبیر اسی دنیا کے عیش و آرام اور کلفت و مشقت سے اور قیامت کی تعبیر بھی انقلابوں سے کر کے سارا معاملہ ہی ختم کر دیا ۔۔۔ ہم باوجود اس کے کہ ہماری نگاہ میں یہ بھی اسلام کی مادی تعبیر ہی کا منطقی تتمہ ہے۔ مذہب کی یہ تعبیر ہمارا موضوعِ بحث نہیں اس لئے کہ چاہے اسے "قرآنی فکر" ہی کا نام کیوں نہ دیا گیا ہو اس کا خالص مادی اور خلافِ قرآن ہونا اظہر من الشمس ہے ۔۔۔ ہم نے اس فکر کی جانب کچھ اشارے کئے بھی ہیں تو محض ضمنی طور پر تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ دین و مذہب کی مادی تعبیر کا سلسلہ بالآخر یہاں تک جا پہنچا ہے ؎

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج



اسلام کی بنیاد ایمان پر ہے اور احیائے اسلام کا خواب ایمان کی عمومی تجدید کے بغیر کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا! مسلمان ممالک کی سیاسی آزادی و خود اختیاری بھی یقیناً بہت اہم ہے اور اس سے بھی ایک حد تک اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی راہ ہموار ہوئی ہے۔ اسی طرح اسلامی نظامِ زندگی کا تصور اور اس پر ایک بہتر نظامِ حیات ہونے کے اعتبار سے اعتماد بھی ایک حد تک مفید اور قابلِ قدر ہے۔ اور جن تحریکوں کے ذریعے یہ پیدا ہوا یا ہو رہا ہے ان کی سعی و جہد بھی احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ لیکن اصل اور اہم تر کام ابھی باقی ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ عالمِ اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگ اس امر کی جانب متوجہ ہوں اور جنہیں اس کی اہمیت کا احساس ہو جائے وہ اپنی تمام تر سعی و جہد کو اس پر مرکوز کر دیں کہ امت میں تجدیدِ ایمان کی ایک عظیم تحریک برپا ہو اور ایمان نرے اقرار اور محض 'قال' سے بڑھ کر 'حال' کی صورت اختیار کر لے!

ایمان لا محالہ کچھ ماوراء الطبیعیاتی حقائق پر یقین کا نام ہے۔ اور اس راہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ انسان ان دیکھی حقیقتوں پر دکھائی دینے والی چیزوں سے زیادہ یقین رکھنے اور سر کے کانوں سے سنی جانے والی باتوں سے کہیں زیادہ اعتماد ان باتوں پر کرے جو صرف دل کے کانوں سے سنی جا سکتی ہیں۔ گویا "ایمان بالغیب" اس راہ کی شرطِ اولین ہے اور اس کے بعد فکر و نظر کا یہ انقلاب اور نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی یہ تبدیلی لازمی و لابدی ہے کہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی و خیالی نظر آنے لیکن ذاتِ خداوندی ایک زندۂ جاوید حقیقت معلوم ہو۔ کائنات کا پورا سلسلہ نہ از خود قائم معلوم ہو نہ کچھ بندھے ٹکے قوانین کے تابع چلتا نظر آئے بلکہ ہر آن و ہر سمت ارادۂ خداوندی و مشیتِ ایزدی کی کار فرمائی محسوس و مشہود ہو جائے۔ مادّہ حقیر و بے وقعت نظر آئے لیکن روح ایک حقیقتِ کبریٰ معلوم ہو۔ انسان کا اطلاق اس کے جسدِ حیوانی پر نہ ہو بلکہ اس روحِ ربانی پر کیا جائے جس نے اسے انسان بنایا ۔۔۔ حیاتِ دنیوی فانی و ناپائیدار ہی نہیں بالکل غیر حقیقی و بے وقعت معلوم ہو اور حیاتِ اخروی ابدی و سرمدی اور حقیقی و واقعی نظر آنے لگے! اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے مقابلے میں دنیا و مافیہا کی وقعت حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق مچھر کے پر سے زیادہ محسوس نہ ہو! یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ جب تک امت کے ایک قابلِ ذکر اور مؤثر حصے میں نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی واقعتہً پیدا نہ ہو جائے احیائے اسلام کی آرزو ہرگز شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے گی۔

عوام کی کشتِ قلوب میں ایمان کی تخم ریزی اور آبیاری کا مؤثر ترین ذریعہ ایسے اصحابِ علم و عمل کی صحبت ہے، جن کے قلوب و اذہان معرفتِ ربانی و نورِ ایمانی سے منور، سینے کبر و حسد، بغض و ریاء سے

پاک اور زندگیاں حرص، طمع، لالچ اور حُبِّ دنیا سے خالی نظر آئیں۔ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے نظام کے درہم برہم ہو جانے کے بعد ایسے ہی نفوسِ قدسیہ کی تبلیغ و تعلیم، تلقین و نصیحت اور تربیت و صحبت کے ذریعے ایمان کی روشنی پھیلتی رہی ہے۔ اور اگرچہ جب سے مغرب کی الحاد و مادہ پرستی کے زہر سے مسموم ہواؤں کا زور ہوا، ایمان و یقین کے یہ بازار بھی بہت حد تک سرد پڑ گئے، تاہم ابھی ایسی شخصیتیں بالکل ناپید نہیں ہوئیں جن کے دل روشن، نورِ یقین اور نفس گرم، حرارتِ ایمانی سے معمور ہیں۔ اور اب ضرورت اس کی ہے کہ ایمان و یقین کی ایک عام رَو ایسی چلے کہ قریہ قریہ اور بستی بستی ایسے صاحبِ عزیمت لوگ موجود ہوں جن کی زندگیوں کا مقصدِ وحید خدا کی رضا جوئی اور اس کی خوشنودی کا حصول ہو اور جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمانِ مبارک کے مطابق کہ لَأَنْ يَهْدِيَ بِكَ اللّٰهُ رَجُلًا وَاحِدًا خَيْرٌ لَكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ [1] خلق کی ہدایت و رہنمائی کو زندگی کا واحد نصب العین قرار دے لیں ۔۔۔ اور اس کے سوا ان کی زندگی میں کوئی اور تمنا، آرزو یا حوصلہ و امنگ باقی نہ رہے۔

خوش قسمتی سے برصغیر ہند و پاک میں ایک وسیع پیمانے پر ایسی حرکت پیدا ہو بھی چکی ہے جس کے زیرِ اثر عوام میں ایمان کی روشنی پھیل رہی ہے اور کائنات سے زیادہ خالقِ کائنات، مادے سے زیادہ روح اور حیاتِ دنیوی سے زیادہ حیاتِ اُخروی کی اہمیت کا احساس اجاگر ہو رہا ہے۔ ہماری مراد جماعتِ تبلیغی سے ہے جسے بجا طور پر تحریکِ دیوبند کی ایک شاخ قرار دیا جا سکتا ہے اور جس کی تاسیس کچھ ایسے اصحابِ ایمان و یقین کے ہاتھوں ہوئی ہے کہ آج ایک تہائی صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی، اور اس کے باوجود کہ اس کے طریقِ کار سے ہم کلیتاً اتفاق نہیں کرتے ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس کے زیرِ اثر لوگوں کے طرزِ فکر اور نقطۂ نظر میں ایک ایسی عمومی تبدیلی واقعۃً پیدا ہو جاتی ہے، جس کے نتیجے میں وہ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اصل حیثیت کائنات کی نہیں خالقِ کائنات کی ہے اور اصل اہمیت اسباب کی نہیں مسبب الاسباب کی ہے۔ بھوک غذا سے نہیں حکمِ خداوندی سے مٹتی ہے اور پیاس پانی سے نہیں اذنِ باری تعالیٰ سے بجھتی ہے! دین کے چھوٹے سے چھوٹے احکام نہیں کسی منطقی استدلال کی بنا پر یا کسی نظامِ زندگی کے اجزا یا اس کو قائم کرنے کے ذرائع کی حیثیت سے نہیں بلکہ فی نفسہٖ خیر نظر آنے لگتے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چھوٹی سی چھوٹی سنتیں بجائے

---

[1] حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: "اگر اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعے کسی ایک انسان کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ بہتر ہے!"



خود نورانی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور زندگی اور اس کے لوازمات کے باب میں کم از کم پر قناعت کر کے وہ اپنے اوقات کا معتد بہ حصہ ایک مخصوص طریق پر تبلیغ و اشاعتِ دین کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔!

لیکن چونکہ اس تحریک میں اصل تخاطب عقل سے نہیں جذبات سے ہے۔ اور اس کی اصل اساس علم پر نہیں عمل پر ہے۔ لہٰذا اس کے اثرات محدود ہیں اور معاشرے کے وہ طبقے جن کے یہاں جذبات پر عقل اور عمل پر علم کو اولیت حاصل ہے اس سے اثر پذیر نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ اپنی ذہنی ساخت کی بنا پر مجبور ہوتے ہیں کہ عقل کی جملہ وادیاں طے کر کے عشق کی وادی میں قدم رکھیں اور خرد کی تمام گتھیاں سلجھانے کے بعد صاحبِ جنون ہوں۔ پھر یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ اسی قسم کے لوگ ہر دور اور ہر معاشرے کی ذہین اقلیت (INTELLECTUAL MINO-RITY) ہوتے ہیں جو از خود معاشرے کی رہنمائی کے منصب پر فائز اور اجتماعیت کی پوری باگ ڈور پر قابض ہوتے ہیں ۔۔۔! ۔۔۔ لہٰذا ان کے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی تبدیلی اور ان کے فکر و نظر کے انقلاب کو اولین اہمیت حاصل ہے ۔۔۔ اور اگر خدانخواستہ ایمان ان لوگوں کے دلوں میں جاگزیں نہ ہو سکے، اور انہیں جہالت و جاہلیت کی ظلمتوں سے نکالا نہ جا سکے تو صرف عوام الناس کے قلوب و اذہان کی تبدیلی سے کسی موثر اور پائیدار تبدیلی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

بنابریں وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک زبردست علمی تحریک ایسی اٹھے جو سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات اور معاشرے کے ذہین ترین عناصر کے فکر و نظر میں انقلاب برپا کر دے ۔۔۔ اور انہیں مادیت و الحاد کے اندھیروں سے نکال کر ایمان و یقین کی روشنی میں لے آئے اور خدا پرستی و خود شناسی کی دولت سے مالا مال کر دے۔ خالص علمی سطح پر اسلامی اعتقادات کے مدلل اثبات اور الحاد و مادہ پرستی کے پرزور ابطال کے بغیر اس مہم کا سر ہونا محال ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ چونکہ موجودہ دور میں فاصلے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں اور پوری نوعِ انسانی ایک کنبے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ لہٰذا علمی سطح کا تعین کسی ایک ملک کے اعتبار سے نہیں بلکہ پوری دنیا کے اعلیٰ ترین معیار کے مطابق کرنا ہو گا ۔۔۔ اور اگرچہ یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ کام انتہائی کٹھن اور سخت محنت طلب ہے لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس کے بغیر اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے خواب دیکھنا جنت الحمقاء میں رہنے کے مترادف ہے۔

پیشِ نظر علمی تحریک کے لئے سب سے پہلے ایسے ذہین اور باصلاحیت نوجوانوں کو ...... تلاش کرنا ہو گا جن میں علم کی ایک شدید پیاس فطری طور پر موجود ہو۔ جن کے قلوب مضطرب اور

رو میں بے چین ہوں، جن کو خود اپنے اندر یہ احساس موجود نظر آئے کہ اصل حقیقت حواس کی سرحدوں سے بہت پرے واقع ہے اور جن میں حقیقت کی تلاش و دریافت کا داعیہ اتنا شدید ہو جائے کہ وہ اس کے لئے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں اور آرام و آسائش کے حصول اور خوشنما مستقبل (CAREERS) کی تعمیر سے یکسر بے نیاز ہو جائیں۔

ایسے نوجوانوں کو اولاً انسان کی آج تک کی سوچ بچار کا مکمل جائزہ لینا ہوگا اور اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ انسانی فکر کی پوری تاریخ کا گہرا مطالعہ کریں اور جن لق و دق صحراؤں میں انسانی سوچ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہی ہے ان سب کی دشت پیمائی کریں۔ اس اعتبار سے منطق، ماوراء الطبیعیات، نفسیات، اخلاقیات اور روحانیات ان کے مطالعہ و غور و فکر کا اصل میدان ہوں گے۔ (اگرچہ ضمنی طور پر عمرانیات اور طبیعیات کی ضروری معلومات کی تحصیل بھی ناگزیر ہوگی) ــــ فکر انسانی کے اس گہرے اور تحقیقی مطالعے کے ساتھ ساتھ ان کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ وحیِ آسمانی اور اس کے آخری جامع اور مکمل ایڈیشن یعنی قرآن حکیم کا گہرا مطالعہ حقیقت کی تلاش اور حقیقتِ نفس الامری کی دریافت کے نقطۂ نگاہ سے کریں۔

> پھر اگر ایسا ہو کہ قرآن کی روشنی ان پر واضح ہو جائے، اس کا پیغام انہیں اپنی فطرت کی آواز معلوم ہو، اس کے نور سے ان کے قلوب و اذہان منور ہو جائیں۔ آفاق و انفس کی حقیقت و ماہیت کے بارے میں تمام بنیادی سوالوں کا تشفی بخش جواب انہیں مل جائے۔ اور انبساطِ معرفت سے ان کے نفوس میں امن اور سکون و اطمینان کی کیفیت پیدا ہو جائے ــ تو اسی کا نام ایمان ہے ــــ!

پھر یہی لوگ ہوں گے جنہیں "رسوخ فی العلم" حاصل ہوگا، جن کا علم ذہنی و اخلاقی آوارگی کے بجائے تقویٰ و خشیتِ الٰہی پر منتج ہوگا، جن کی شخصیتیں "إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ"[1] کی مجسم تفسیر اور "قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن" کی عملی تصویر ہوں گی ــــ اس لئے کہ قرآن کا مغز دراصل یہی "علم حقیقت" ہے جس کا دوسرا نام ایمان ہے۔ "قانون و شریعت" کی اہمیت بجائے خود اگرچہ نہایت عظیم ہے لیکن اس کے مقابلے میں ان کی حیثیت واقعۃً "ثانوی" کی ہے! ــــ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کیفیت ایمانی کی تحصیل کے بغیر قرآن کے بیان کردہ قانون شریعت پر غور و فکر بالکل بے کار ہے۔ یہی وجہ ہے جو حضرت ابن عباسؓ کے اس قول میں بیان ہوا کہ تعلمنا الایمان ثم تعلمنا القرآن[2]

[1] آیت قرآنی: "اللہ کی خشیت اس کے اہل علم بندوں ہی کے دلوں میں گھر کرتی ہے"!

[2] ہم نے پہلے ایمان سیکھا اور پھر قرآن۔



مغرب کے فلسفہ و فکر کے موثر ابطال اور اس کی تہذیب و تمدن کے وقعی استیصال کا کٹھن کام صرف ان لوگوں کے بس کا ہے جو "علمِ حقیقت" کے ان چشموں سے اچھی طرح سیراب ہوں جو قرآن حکیم کی آیات بینات کی صورت میں رواں ہیں۔ ان ہی کے لئے ممکن ہوگا کہ وہ آج کے فلاسفہ کے لئے ایک نئی "تہافت" تصنیف کر سکیں اور آج کے منطقیین پر از سر نو "رد" کر سکیں اور فی الجملہ الحاد و مادہ پرستی کے اس سیلاب کا رخ پھیر دیں جو تقریباً دو صدیوں سے ذہن انسانی کو بہائے لئے چلا جا رہا ہے!

اس تخریب کے ساتھ انہیں جدید علم الکلام کی تاسیس کا مثبت کام بھی کرنا ہوگا، تاکہ ریاضی، طبیعیات، فلکیات اور نفسیات کے میدان میں جن حقائق کی دریافت آج تک ہوئی ہے[1] اور جو اسی حقیقتِ کُلی کی ادنیٰ جزئیات ہیں جن کا مظہر اتم ایمان ہے، انہیں اسلامی عقائد کے نظام میں اپنے اپنے مقام پر صحیح طور سے فِٹ کیا جا سکے۔ آج سے پینتیس چالیس سال قبل علامہ اقبال مرحوم نے "الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید" کے سلسلے میں جو کام کیا تھا اس کا وہ حصہ تو اگرچہ بہت محل نظر ہے جو شریعت و قانون اور اجماع و اجتہاد سے بحث کرتا ہے (اور جو فی الواقع "الٰہیات" سے براہ راست متعلق بھی نہیں ہے) تاہم اپنے اصل موضوع کے اعتبار سے علامہ مرحوم کی یہ کوشش بڑی فکر انگیز تھی اور جیسا کہ خود علامہ نے کتاب کے دیباچے میں فرمایا تھا کہ "ہو سکتا ہے کہ جیسے جیسے علم آگے بڑھے اور فکر کی نئی راہیں کھلیں زیر نظر کتاب میں جو خیالات بیان ہوئے ہیں، ان کے علاوہ بلکہ ان سے صحیح تر خیالات ظاہر ہوں۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم انسانی فکر کے ارتقاء کا ایک آزادانہ تنقیدی نقطۂ نگاہ سے مسلسل جائزہ لیتے رہیں ..." اگر انہی خطوط پر کام جاری رہتا اور کچھ باہمت لوگ اس کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے تو ایک بہت وسیع و قابل قدر کام ہو جاتا لیکن افسوس کہ خود علامہ مرحوم کے حلقۂ اثر میں سے بھی کسی نے اس میدان کو اپنی ... جولانیٔ طبع کے لئے منتخب نہیں کیا ــــ!

> بہرحال جب تک اس میدان میں واقعی قدر و قیمت رکھنے والا کام ایک قابلِ ذکر حد تک نہیں ہو جاتا یہ امید کہ معاشرے کے ذہین طبقات کو مذہب کی طرف راغب کیا جا سکے گا، محض سراب کا درجہ رکھتی ہے ــــ!

"الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید" کے بعد دوسرا اہم ترین کام یہ ہے کہ حیاتِ دنیوی کے مختلف پہلوؤں یعنی سیاست و قانون اور معاشرت و معیشت کے باب میں اسلام کی ہدایت و رہنمائی کو

[1] واضح رہے کہ اس ضمن میں "حقائق" اور "نظریات" کے مابین فرق و امتیاز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

مدلّل و مفصل واضح کیا جائے۔ اس ضمن میں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے پچھلے تیس چالیس سال کے عرصے میں خاصا کام مصر اور برصغیر پاک و ہند میں ہوا ہے خصوصاً جماعت اسلامی اور الاخوان المسلمون نے "اسلامی نظام حیات" اور "عدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام" کو تصنیف و تالیف کا مرکزی موضوع بنایا ہے تاہم اس سارے کام کو بس ایک اچھی ابتدا قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور ادھر کچھ عرصے سے مکھی پر مکھی مار دینے اور تقریباً ایک سی سطح اور ایک سے معیار کی تالیفات مختلف ناموں سے شائع کر دینے کا جو سلسلہ چل نکلا ہے اس نے بہت حد تک اس اساسی کام کی اہمیت بھی ختم کر دی ہے جو بجائے خود خاصا قابل قدر تھا۔ اس ضمن میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ نیم خواندہ یا بقول مولانا اصلاحی "پڑھے کم لکھے زیادہ" لوگوں کی تصنیفات و تالیفات کی ایک خاص تکنیک کے ذریعے ایک مخصوص حلقے میں فروخت سے بعض لوگوں کا معاشی مسئلہ تو ضرور حل ہو سکتا ہے دین کی کوئی مثبت اور پائیدار خدمت ممکن نہیں ہے۔ آج کی دنیا میں خصوصاً اعلیٰ ذہنی صلاحیتیں رکھنے والے لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ مسلّمہ علمی قابلیت رکھنے والے لوگوں کے سوا کسی مؤلف و مصنف کی جانب التفات کر سکیں — لہٰذا لازم ہے کہ جو کام بھی کیا جائے وہ معیاری ہو اور کمیت سے زیادہ کیفیت پیش نظر رہے۔

اس کام کے لئے بھی ظاہر ہے کہ ایک طرف موجودہ دنیا کے مسائل و معاملات کا صحیح فہم اور عمرانیات کے مختلف میدانوں میں جدید رجحانات کا براہ راست علم ضروری ہے اور دوسری طرف قرآن و سنت میں گہری مہارت لازمی ہے اور جب تک یہ صورت نہ ہو کہ ان دونوں اطراف کا مطالعہ یکساں وسعت نظر کے ساتھ کیا جائے معیاری نتائج کی توقع عبث ہے۔

---

مذکورہ بالا علمی تحریک کے اجراء کے لئے فوری طور پر دو چیزیں لازمی ہیں۔ ایک یہ کہ عمومی دعوت و تبلیغ کا ایک ایسا ادارہ قائم ہو جو ایک طرف تو عوام کو تجدید ایمان اور اصلاح اعمال کی دعوت دے اور جو لوگ اس کی جانب متوجہ ہوں ان کی ذہنی و فکری اور اخلاقی و عملی تربیت کا بندوبست کرے اور ساتھ ہی اس علمی کام کی اہمیت ان لوگوں پر واضح کرے جو خلوص اور دردمندی کے ساتھ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے آرزومند ہیں اور دوسری طرف ایسے ذہین نوجوانوں کو تلاش کرے جو پیش نظر علمی کام کے لئے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں — آج کے دور میں، جبکہ مادیت اور دنیا پرستی کا قلوب و اذہان پر مکمل تسلط ہے اور پھر فی الواقع طلب معاش کا مسئلہ اتنا کٹھن ہو گیا ہے کہ اکثر لوگوں کو اپنی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں اسی کے حل پر مرکوز کر دینی پڑتی ہیں، پھر معاشرے کا عام رجحان

باقی صـ ۲۰ پر



تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

# تفسیر سورۂ نساء

★ ——— (۴)

## ۱۶ — آگے کا مضمون (۳۴-۳۵)

اوپر ولا تتمنوا — الآیہ میں عورت اور مرد دونوں کو اپنے اپنے فطری و شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے حصول سعادت و کمال کی جدوجہد کی جو ہدایت فرمائی تھی اسی ہدایت کو خاندانی زندگی کی تشکیل و تنظیم کے لئے رہنما اصول قرار دے کر اب یہ خاندان کی تنظیم کے لئے ہدایات دی جا رہی ہیں۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ معاشرہ خاندانوں سے مرکب ہوتا ہے اور معاشرے سے ریاست وجود میں آتی ہے۔ گویا خاندان ہی وہ چیز ہے جو معاشرہ اور پھر ریاست کی بنیادی اینٹ ہے۔ اس وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ یہ پہلی اینٹ نہایت صحیح رکھی جائے اگر یہ ذرا بھی کج ہو گئی تو ع تا ثریا مے رود دیوار کج۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

الرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ
فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۚ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ
وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۗ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ
حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

ترجمہ: مرد عورتوں کے سرپرست ہیں، بوجہ اس کے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے اور بوجہ اس کے کہ انہوں نے اپنے مال خرچ کئے۔ پس جو نیک بیبیاں ہیں وہ فرماں برداری کرنے والی، رازوں کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں بوجہ اس کے کہ خدا نے بھی رازوں کی حفاظت فرمائی ہے۔ اور جن سے تمہیں سرتابی کا اندیشہ ہو تو ان کو نصیحت کرو اور ان کو ان کے بستروں میں تنہا چھوڑ دو اور ان کو سزا دو۔ پس اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف راہ نہ ڈھونڈو۔ بے شک اللہ بہت بلند اور بہت بڑا ہے۔ ۳۴

اور اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان افتراق کا اندیشہ ہو تو ایک پنچ مرد کے لوگوں میں سے مقرر کرو اور ایک پنچ عورت کے لوگوں میں سے۔ اگر دونوں اصلاح کے طالب ہوئے تو اللہ ان کے درمیان سازگاری پیدا کر دے گا۔ بے شک اللہ علیم و خبیر ہے۔ ۳۵

## ۱۷ - الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۭ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۭ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاهْجُرُوْھُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ۳۴

قوام کا مفہوم

عربی میں قام کے بعد علیٰ آتا ہے تو اس کے اندر نگرانی، محافظت، کفالت اور تولیت کا مضمون پیدا ہوتا ہے۔ "قوامون علی النساء" میں بالاتری کا مفہوم بھی ہے اور کفالت و تولیت کا بھی اور یہ دونوں باتیں کچھ لازم و ملزوم سی ہیں۔

گھر کی چھوٹی سی وحدت بھی، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ جس طرح ہر ریاست اپنے قیام و بقا کے لئے ایک سربراہ کی محتاج ہوتی ہے اسی طرح یہ ریاست بھی ایک سربراہ کی محتاج ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس ریاست میں سربراہی کا مقام مرد کو حاصل ہو یا عورت کو؟ قرآن نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ مقام مرد کو حاصل ہے۔ اور اس کے حق میں دو دلیلیں دی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر فضیلت بخشی ہے۔ مرد کو بعض صفات میں عورت پر نمایاں تفوق حاصل ہے جن کی بنا پر وہی سزاوار ہے کہ قوامیت کی ذمہ داری اسی پر ڈالی جائے۔ مثلاً محافظت و مدافعت کی جو قوت و صلاحیت یا کمانے اور ہاتھ پاؤں مارنے کی جو استعداد و ہمت اس کے اندر ہے۔ وہ عورت کے اندر نہیں ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں زیر بحث کل فضیلت نہیں ہے بلکہ صرف وہ فضیلت ہے جو مرد کی قوامیت کے استحقاق کو ثابت کرتی ہے۔ بعض دوسرے پہلو عورت کی فضیلت کے بھی ہیں لیکن ان کو قوامیت سے تعلق نہیں ہے۔ مثلاً عورت گھر در سنبھالنے اور بچوں کی پرورش و نگہداشت کی جو صلاحیت رکھتی ہے وہ مرد نہیں رکھتا۔ اسی وجہ سے قرآن نے یہاں بات کو ابہام کے انداز میں فرمایا ہے۔ جس سے مرد اور عورت دونوں کا کسی نہ کسی پہلو سے صاحب فضیلت ہونا نکلتا ہے۔ لیکن قوامیت کے پہلو سے مرد ہی کی فضیلت کا پہلو راجح ہے۔

دوسری یہ کہ مرد نے عورت پر اپنا مال خرچ کیا ہے۔ یعنی بیوی بچوں کی معاشی اور کفالتی ذمہ داری



تمام اپنے سر اٹھائی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری مرد نے اتفاقیہ یا تبرعاً نہیں اٹھائی ہے۔ بلکہ اس وجہ سے اٹھائی ہے کہ یہ ذمہ داری اسی کے اٹھانے کی ہے وہی اس کی صلاحیتیں رکھتا ہے اور وہی اس کا حق ادا کر سکتا ہے۔

مرد کو قوامیت کے منصب پر سرفراز کرنے کے بعد نیک بیبیوں کا رویہ بتایا کہ وہ نہایت فرماں برداری کے ساتھ اپنے قوام کی اطاعت کرتی، اس کے رازوں اور اس کی عزت و ناموس کی حفاظت کرتی رہیں۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو عورتیں، اس کے بالکل برعکس آج اس بات کے لئے زور لگا رہی ہیں کہ وہ عورت بن کر نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں مرد بن کر رہیں گی وہ صالحات نہیں بلکہ فاسقات ہیں۔ اور انھوں نے اس نظام کو بالکل تلپٹ کر دینا چاہا ہے جس پر عائلی زندگی کی تمام برکتوں اور خوشحالیوں کا انحصار ہے۔[1]

حافظات للغیب کا مفہوم

"حافظات للغیب" کا مطلب میں نے یہ لیا ہے کہ وہ رازوں کی حفاظت کرنے والی ہیں۔ یہ معنی لینے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ "غیب" کا لفظ راز کے مفہوم کے لئے مشہور ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں ترکیب کلام ایسی ہے کہ "پیٹھ پیچھے" کے معنی لینے کی گنجائش نہیں۔ تیسری یہ کہ عورت اور مرد کے درمیان رازوں کی امانت داری کا مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والا مسئلہ ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے قدرتی امین ہیں۔ بالخصوص عورت کا مرتبہ تو یہ ہے۔ کہ وہ مرد کے محاسن و معایب، اس کے گھر در، اس کے احوال و املاک اور اس کی عزت و ناموس ہر چیز کی ایسی رازداں ہے کہ اگر وہ اس کا پردہ چاک کرنے پر آجائے تو مرد بالکل ہی ننگا ہو کر رہ جائے۔ اس وجہ سے قرآن نے اس صفت کا خاص طور پر ذکر فرمایا۔ اور اس کے ساتھ "بما حفظ اللہ" کا جو اضافہ ہے اس سے اس صفت کی عالی نسبی کا اظہار مقصود ہے کہ ان کی اس صفت پر خدا کی صفت کا ایک پرتو ہے اس لئے کہ خدا نے بھی اپنے بندوں اور بندیوں کے رازوں کی حفاظت فرمائی ہے ورنہ اگر وہ لوگوں کا پردہ چاک کرنے پہ آجاتا تو کون ہے جو کہیں منہ دکھانے کے قابل رہ جاتا۔

نشوز کی حقیقت

"نشوز" کے معنی سر اٹھانے کے ہیں لیکن اس لفظ کا غالب استعمال اس سرتابی و سرکشی کے لئے ہوتا ہے جو کسی عورت کی طرف سے اس کے شوہر کے مقابل میں ظاہر ہو۔ اگر کسی عورت کے رویے سے یہ ظاہر ہو کہ یہ سرکشی کی راہ پر چل پڑی ہے تو مرد چونکہ قوام ہے۔ اس وجہ سے اس کو عورت

[1] مساوات مرد و زن کے جدید نظریے کے ہر پہلو پر مفصل بحث ہم نے اپنی کتاب "پاکستانی عورت" میں کی ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

کی تادیب کے لئے بعض تادیبی اختیارات دیئے گئے ہیں۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ قرآن نے یہ اختیارات صرف اس صورت کے لئے دیئے ہیں جب "نشوز" کا اندیشہ ہو۔ "نشوز" جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، عورت کی ہر کوتاہی یا غفلت یا بے پروائی یا اپنی شخصیت اور ذہنی رجحان اور ذوق کے اظہار کی قدرتی خواہش کو نہیں کہتے۔ نشوز یہ ہے کہ عورت کوئی ایسا قدم اٹھاتی نظر آئے جو مرد کی قوامیت کو چیلنج کرنے والا اور جس سے گھر کی مملکت میں بدامنی اور اختلال پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ اگر ایسی صورت پیدا ہوتی نظر آئے تو مرد تین صورتیں اختیار کر سکتا ہے اور قرآن کا انداز بیان دلیل ہے کہ ان میں ترتیب و تدریج ملحوظ ہے۔

پہلا مرحلہ یہ ہے کہ نصیحت و ملامت کرے۔ قرآن میں 'وعظ' کا لفظ ہے جس کے اندر فی الجملہ زجر و توبیخ کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ اگر اس سے کام چلتا نظر نہ آئے تو دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ان سے بے تکلفانہ قسم کو خلا ملا ترک کر دے تاکہ انہیں اندازہ ہو جائے کہ اگر انہوں نے اپنی روش نہ بدلی تو اس کے نتائج دور رس ہو سکتے ہیں۔ اگر معاملہ اس سے بھی بنتا نظر نہ آئے تو آخری درجے میں مرد کو جسمانی سزا دینے کا بھی اختیار ہے۔ لیکن یہ بس اس حد تک ہونی چاہئے جس حد تک ایک معلم و مؤدب اپنے کسی زیر تربیت شاگرد کو دے سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے 'غیر مبرح' کے الفاظ سے اس کی حد واضح فرمائی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سزا ایسی نہ ہو کہ وہ اپنا کوئی پائیدار اثر چھوڑ جائے۔

مرد کے تادیبی اختیارات کی یہ آخری حد ہے اگر اس کا نتیجہ مفید مطلب برآمد ہو، عورت بغاوت کی بجائے اطاعت کی راہ پر آجائے تو پچھلی کدورتوں کو بھلا دینا چاہئے اس سے انتقام لینے کے بہانے نہیں ڈھونڈنے چاہئیں۔ مرد کو اپنی قوامیت کے زعم میں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ سب سے بلند اور سب سے بڑا خدا ہے۔ جب وہ قیم السماوات والارض ہو کر ہم سب کے نشوز سے درگذر فرماتا اور توبہ و اصلاح کے بعد سب کی نافرمانیوں کو معاف کر دیتا ہے تو بندے اپنی قوامیت کی لے اس کی حد سے آگے کیوں بڑھائیں!۔

وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا ۝٣٥

اگر مرد وہ سارے جتن جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئے کرنے کے بعد بھی عورت کے نشوز پر قابو نہ پا سکا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ خلیج اختلاف بہت وسیع ہے اور تعلقات ٹوٹنے کی حد پر پہنچے ہوئے ہیں۔ لیکن اس حد پر پہنچ جانے کے بعد بھی شریعت نے مرد کو یہ اجازت نہیں دی کہ وہ بیوی کو طلاق دے کر اس سے پیچھا چھڑا لے۔ اسلام، میاں بیوی کے رشتے کو معاشرے کے استحکام



کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے ٹوٹنے کو صرف اسی صورت میں گوارا کرتا ہے جب اصلاح کی تمام ممکن تدبیریں اختیار کر چکنے کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ اب اس کا جڑا رہنا ناممکن یا مزید فساد کا باعث ہے۔ چنانچہ شوہر کی کوششوں کی ناکامی کے بعد اصلاح احوال کے لئے ایک دوسری تدبیر اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی۔ یہ ہدایت میاں بیوی کی قوم، قبیلہ، برادری اور ان کے رشتہ داروں اور خیر خواہوں کو دی گئی ہے کہ اب وہ آگے بڑھیں اور اپنے اثرات سے کام لے کر اس بگاڑ کی اصلاح کی کوشش کریں۔ اس کی عملی شکل یہ بتائی کہ ایک پنچ میاں کے رشتہ داروں میں سے منتخب کیا جائے اور دوسرا بیوی کے خاندان میں سے۔ یہ دونوں مل کر اصلاح کی کوشش کریں۔ بسا اوقات فریقین جس جھگڑے کو خود طے کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے دوسرے خیر خواہوں کی مداخلت سے وہ طے ہو جاتے ہیں۔ فریقین کو ان کی عزت و جانبداری اور خیر خواہی کا احترام بھی کرنا پڑتا ہے اور بے جا ضد پر دوسروں کی ملامت کا اندیشہ بھی ہوتا ہے اس وجہ سے یہ شکل زیادہ موثر اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔

'ان یریدا اصلاحا یوفق اللہ بینھما' میں اگرچہ تکلیں بھی ہو سکتے ہیں لیکن میرا رجحان اس طرف ہے کہ اس سے مراد میاں بیوی ہی ہیں یعنی اگر یہ دونوں بے جا ضد چھوڑ کر اصلاح احوال کے طالب ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان میں سازگاری پیدا کر دے گا۔ یہ درحقیقت نہایت بلیغ اسلوب سے میاں بیوی کو تشویق و ترغیب ہے کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں اور افتراق کے بجائے خدائے کریم و کارساز کی طرف سے سازگاری کے طالب بنیں۔

اس آیت میں ہمارے نزدیک خطاب، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، میاں بیوی کے خویش و اقارب اور ان کی قوم و قبیلہ کے بڑے بوڑھوں سے ہے اور ان پنچوں کا اختیار تمام تر اصلاح حال کی کوشش تک ہی محدود ہے۔ اس کوشش کی ناکامی کے بعد شوہر اپنے شرعی اختیارات کے مطابق خود بھی کوئی قدم اٹھا سکتا ہے اور معاملہ عدالتی نوعیت کا ہو تو عدالت میں بھی جا سکتا ہے۔ البتہ اس بات کی گنجائش ہے کہ کوئی معاملہ عدالت میں جانے کے بعد عدالت کی طرف سے کسی پنچایت کے حوالہ کر دیا جائے اور عدالت پنچایت کو فیصلہ کا اختیار بھی تفویض کر دے۔

آخر میں علیم و خبیر کی صفات کے حوالے سے مقصود ہر ایک کو تنبیہ کرنا ہے کہ خدا اچھی طرح باخبر ہے کہ اس قضیے میں کس کا رول کیا رہا ہے اور اسی کے مطابق وہ اس کے ساتھ معاملہ کرے گا۔

## ۱۸- آگے کا مضمون آیات ۳۶-۴۲

آگے اب یہ خاتمۂ باب کی آیات ہیں۔ معاشرتی احکام و ہدایات کا سلسلہ جو شروع سے چلا آرہا

تھا وہ ان آیات پر ختم ہو رہا ہے۔ جس طرح اللہ سے ڈرتے رہنے کی ہدایت سے اس باب کا آغاز فرمایا تھا اسی طرح اللہ کی عبادت کرتے رہنے کی ہدایت پر اس کو ختم کیا۔ اللہ تعالیٰ کا حق سب سے بڑا حق ہے۔ جو لوگ اس حق کو کما حقہ' ادا کرتے رہیں گے درحقیقت وہی دوسروں کے حقوق ادا کرنے کی توفیق پائیں گے۔ چنانچہ اس حق کی یاددہانی کے بعد بالاجمال والدین، اقربا، یتامیٰ، مساکین، پڑوسی، مسافر اور لونڈی غلام سب کے حقوق کی یاددہانی فرمادی۔ اللہ کا حق اس کی عبادت ہے اور اس کو باطل کرنے والی چیز شرک ہے اس وجہ سے اس حق کی یاددہانی کے ساتھ شرک کی نفی کر دی۔ بندوں کا سب سے بڑا حق ان کے ساتھ احسان اور ان کے لئے انفاق ہے۔ بخل، تکبر اور ریا اس کے اضداد ہیں اس وجہ سے احسان و انفاق کی تاکید کے ساتھ ان چیزوں کی نفی کر دی۔ اس کے بعد انفاق کی حوصلہ افزائی کے لئے فرمایا کہ یہ سودا خسارے کا سودا نہیں ہے جو ایک خرچ کرے گا، دس پائے گا۔ پھر تنبیہ فرمادی کہ اس رسولؐ کے ذریعے سے انذار و تبلیغ کا حق ادا ہو چکا ہے۔ جو اب بھی نہیں سنیں گے وہ سوچ لیں کہ ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جس دن اللہ سب رسولوں کو ان کی امتوں پر گواہ ٹھہرا کر پوچھے گا کہ تم نے اپنی اپنی امتوں کو کیا دعوت دی اور انہوں نے کیا جواب دیا۔ پھر یہی سوال اس آخری امت کے متعلق اس آخری رسولؐ سے بھی ہوگا۔ وہ دن ایسا ہوگا کہ کسی کیلئے کوئی جائے پناہ ہوگی اور نہ کوئی شخص کوئی بات چھپا سکے گا۔

آخر میں اللہ کی عبادت جس کا ذکر اوپر والی آیت میں گزرا ہے      کے سب سے بڑے مظہر، نماز کے بعض آداب و شرائط کا ذکر فرمایا۔ ان آداب و شرائط کے ذکر سے مقصود نماز کو اسی طرح مفسدات سے پاک کرنا ہے جس طرح اوپر انفاق کو اس کے موانع و مفسدات سے پاک کیا ہے ـــــ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ
السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۝ ۳۶ الَّذِيْنَ
يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا
لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ ۳۷ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ
بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَاۗءَ قَرِيْنًا ۝ ۳۸ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ
لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَھُمُ اللّٰهُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِــيْمًا ۝ ۳۹



اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْھَا وَ
يُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ ۴۰ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ
اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰي هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ۝ ۴۱ يَوْمَىِٕذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۭ وَلَا يَكْتُمُوْنَ
اللّٰهَ حَدِيْثًا ۝ ۴۲ يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ
سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ
حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ
مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا
طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝ ۴۳

**ترجمہ** اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو بھی اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور والدین، قرابت مند، یتیم، مسکین، قرابت دار پڑوسی، بیگانہ پڑوسی، ہم نشین، مسافر اور اپنے مملوک کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اترانے اور بڑائی مارنے والے ہیں۔ جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخالت کا مشورہ دیتے ہیں اور اللہ نے اپنے فضل میں سے جو کچھ انہیں دے رکھا ہے اس کو چھپاتے ہیں، ہم نے ایسے ناشکروں کے لئے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے ـــ جو اپنے مال لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور جن کا ساتھی شیطان بن جائے تو وہ نہایت برا ساتھی ہے۔ ان کا کیا بگڑ جاتا اگر یہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان لاتے اور اللہ نے ان کو جو کچھ بخش رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے۔ اللہ تو ان سے اچھی طرح باخبر ہے۔ اللہ ذرا بھی کسی کی حق تلفی نہیں کرے گا۔ اگر ایک نیکی ہوگی تو اس کو کئی گنا بڑھائے گا اور خاص اپنے پاس سے بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔ ۳۶-۴۰

اس دن ان کا کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور تم کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر کھڑا کریں گے۔ اس دن وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور جنہوں نے رسولؐ کی نافرمانی کی تمنا کریں گے کاش ان کے سمیت زمین برابر کر دی جائے۔ اور اس دن وہ خدا سے کوئی بات بھی چھپا نہ سکیں گے۔ ۴۱-۴۲

اے ایمان والو، نشے کے حال میں نماز کے پاس نہ جایا کرو یہاں تک کہ جو کچھ تم زبان سے

کہتے ہو اس کو سمجھنے لگو اور جنابت کی حالت میں، مگر یہ کہ بس گذر جانا پیش نظر ہو، یہاں تک کہ غسل کر لو، اور اگر تم مریض ہو، یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے یا عورتوں سے تم صحبت کیا ہو، پھر پانی نہ میسر آئے تو کوئی پاک جگہ دیکھو اور اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرو۔ بے شک اللہ درگزر کرنے والا، بخشنے والا ہے۔ ۴۳

## ۱۹— الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَۨا ۝ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَاۗءَ قَرِيْنًا ۝

'بالوالدین احساناً' میں 'ب' اس بات پر دلیل ہے کہ یہاں احسان کا لفظ 'بر' کے مفہوم پر مشتمل ہے یعنی یہ احسان ان کے حقوق کے ساتھ ہو، محض پیچھا اتارنے کی کوشش نہ ہو۔ 'ب' کا استعمال لفظ بر کے ساتھ ہی مناسبت رکھتا ہے چنانچہ سورۂ مریم میں ہے۔ وبرا بوالدیہ ولم یکن جبارا عصیا۔ (۱۴) (اور اپنے والدین کا فرماں بردار تھا، سرکش اور نافرمان نہ تھا) اردو ترجمے میں اس طرح کے اسالیب کے ترجمے کا حق مشکل ہی سے ادا ہوتا ہے۔

'الجار ذی القربیٰ' یعنی پڑوسی بھی ہے اور اس کے ساتھ رشتہ داری کا بھی تعلق ہے۔ 'الجار الجنب' جُنُب کے معنی اجنبی کے ہیں یعنی پڑوسی ہے لیکن رشتہ داری اور قرابت کا تعلق اس کے ساتھ نہیں ہے۔ 'الصاحب بالجنب' جنب کے معنی پہلو کے ہیں یعنی جو شخص وقتی اور عارضی طور پر بھی کسی مجلس، کسی حلقے، کسی سواری، کسی دکان، کسی ہوٹل میں آپ کا ہم نشین و ہم رکاب ہو جائے، وہ الصاحب بالجنب ہے۔ اسلامی معاشرہ میں ان تینوں قسم کے لوگوں کو ایک دوسرے پر حقوق جوار حاصل ہو جاتے ہیں۔

ان آیات میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنا حق ادا کرنے کا حکم دیا ہے اس لئے کہ خالق و مالک اور رب ہونے کی وجہ سے اس کا حق سب سے بڑا ہے اور اسی حق کی ادائیگی پر دوسرے حقوق کی ادائیگی کا انحصار ہے جو لوگ خدا کے حق کو ادا نہیں کرتے وہ دوسروں کے حقوق بھی صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق نہیں پاتے۔ خدا کا حق عبادت ہے اور ہم دوسرے مقام میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ عبادت



میں پرستش اور اطاعت دونوں چیزیں شامل ہیں۔ اس عبادت کے لئے یہ شرط ہے کہ اس میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے اس لئے کہ خدا کی خدائی میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں ہے۔ اگر اس حق میں کسی دوسرے کو شریک کر دیا جائے تو یہ عبادت باطل ہو کر رہ جاتی ہے۔

خدا کے بعد سب سے بڑا حق والدین کا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انہی کو آدمی کے وجود میں آنے اور اس کی پرورش کا ذریعہ بنایا ہے۔ لیکن ان کا حق عبادت نہیں بلکہ بر و احسان ہے۔ اس کے بعد قرابت مندوں کے حقوق ہیں جو درحقیقت اسی حق سے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر یتامیٰ، مساکین اور پردیسیوں کے حقوق ہیں۔ پڑوسی تین طرح کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو پڑوسی بھی ہے اور قرابت مند بھی، دوسرا وہ جو پڑوسی تو ہے اگرچہ قرابت مند نہیں ہے، تیسرا وہ جو وقتی طور پر کسی سفر یا حضر میں ساتھی اور ہم نشین بن گیا ہے۔ ان سب کے ساتھ احسان کی ہدایت ہوئی پھر مسافر اور غلاموں لونڈیوں کا ذکر ہے۔ لونڈیوں اور غلاموں کے متعلق ہم ذکر کر چکے ہیں کہ غلامی اسلام کے نظام کا کوئی جزو نہیں ہے۔ اسلام نے وقت کے بین الاقوامی حالات کے تحت اس کو گوارا کیا تھا اور خود اپنے نظام میں ان کی ترقی و بہبود کی ایسی شکلیں تجویز کر دی تھیں جن سے وہ بالتدریج اسلامی معاشرے میں مساوی درجے کے رکن بن جائیں۔ اس آیت میں ان کو بھی احسان کے مستحقوں میں شامل کیا ہے اور مقصود اس سے یہی ہے کہ ان کے متعلق لوگوں کا زاویہ نگاہ بدلے اور لوگ نیکی اور احسان کے مواقع میں ان کی اصلاح و ترقی کو ایک مستقل مسئلہ کی حیثیت سے پیش نظر رکھیں۔

'ان اللہ لا یحب من کان مختالا فخورا' یہ ادائے حقوق اور احسان کی منافی ذہنیت کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اسباب و وسائل کی فراوانی کو اللہ کا انعام و احسان سمجھتے ہیں ان کے اندر تو شکر گزاری اور تواضع کا جذبہ ابھرتا ہے اور یہ جذبہ ان کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح ان پر احسان فرمایا ہے اسی طرح یہ دوسروں پر احسان کریں چنانچہ وہ لوگوں پر احسان کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے سزاوار بنتے ہیں۔ برعکس اس کے جو لوگ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو خود اپنی قوت و قابلیت اور اپنی تدبیر و حکمت کا کرشمہ سمجھنے لگتے ہیں ان کے اندر تواضع اور شکر گزاری کے جذبے کی بجائے گھمنڈ اور فخر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ لوگوں پر احسان کرنے کے بجائے ان پر دھونس اور رعب جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ ایسے ناشکروں اور کم ظرفوں کو دوست نہیں رکھتا۔ "دوست نہیں رکھتا" کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو مبغوض رکھتا اور ان سے نفرت کرتا ہے۔

'الذین یبخلون الآیۃ' اکڑنے اور فخر کرنے والوں کی یہ چند مزید خصوصیات بیان ہوئی ہیں جو

ہم بالترتیب واضح کریں گے۔

پہلی یہ کہ یہ خود بھی بخیل ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں۔ بخیل اس شخص کو کہتے ہیں جو دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں تنگ دل ہو۔ جو شخص دوسروں کے حقوق فیاضی اور کشادہ دلی کے ساتھ ادا کرتا ہے لیکن خود اپنی ذات کے معاملے میں احتیاط و کفایت برتتا ہے اس کو بخیل نہیں کہتے۔ بخالت کا بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے مال و اسباب کو خدا کی دین سمجھنے کے بجائے خود اپنی تدبیر و قابلیت کا کرشمہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے اندر تواضع اور شکرگزاری کا وہ جذبہ ہی مردہ ہو جاتا ہے جو فیاضی اور جود و کرم کا اصل محرک ہے۔ بخیل آدمی خود ہی بخالت نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو بھی بخالت کا مشورہ دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کی فیاضی سے خود اس کی بخالت کا راز فاش ہو جاتا ہے۔ اپنے اس عیب پر پردہ ڈالے رکھنے کے لئے اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح وہ دوسروں کے حقوق دبائے بیٹھا ہے اسی طرح دوسرے بھی بیٹھے رہیں کہ کوئی ناک والا ہو گا نہ اس کو نکو بننا پڑے گا۔ قاعدہ ہے کہ جو آدمی بزدل ہوتا ہے وہ دوسروں کو بھی بزدلی ہی کا درس دیتا ہے تاکہ خود اس کی بزدلی کا بھانڈا نہ پھوٹے۔

دوسری یہ کہ یہ اللہ کے اس فضل کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے ان کو دے رکھا ہے۔ یہ بخیل مالداروں کے ایک نہایت مخفی نفسیاتی پہلو کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ بخیل مالداروں کی خواہش ایک طرف تو یہ ہوتی ہے کہ ہر شخص پر ان کی ریاست و امارت کی دھونس جمی رہے دوسری طرف یہ کوشش بھی وہ کرتے رہتے ہیں کہ کوئی شخص ادائے حقوق کے معاملے میں ان کو کوئی ملامت نہ کر سکے۔ چنانچہ یہ ہر ملنے جلنے والے اور ہر طالب وسائل کے سامنے اپنے وسیع اخراجات، اپنے کاروبار میں نقصانات، اپنی پھیلی ہوئی ذمہ داریوں اور طالبوں اور سائلوں کی کثرت کا دکھڑا روتے رہتے ہیں تاکہ ہر شخص یہ سمجھے کہ ہے تو یہ شخص ایک غنی دیا مل لیکن بے چارہ کیا کرے بڑی بھاری ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے اس وجہ سے ہزاروں لاکھوں کی آمدنی رکھنے کے باوجود اس کے پاس بچا بچایا کچھ بھی نہیں۔

واعتدنا للکافرین عذابا مھینا۔ ایسے ناشکروں اور کافر نعمتوں کے لئے فرمایا کہ ہم نے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ذلیل کرنے والا عذاب اس وجہ سے کہ یہ اللہ کی نعمت پا کر اس کے شکر گزار اور حق گزار بندے بننے کے بجائے اکڑنے اور اترانے والے اور اس کے فضل کو چھپانے والے بنے۔

والذین ینفقون الآیۃ۔ یہ بھی اسی سلسلے کی بات ہے جس کا ذکر اوپر ہوا یعنی یہ اگر خرچ کرتے ہیں تو محض دکھاوے کے لئے۔ دکھاوے کا خرچ ایک کاروباری خرچ ہوتا ہے۔ اول تو شاذ و نادر ہی اس کا فائدہ ان لوگوں کو پہنچتا ہے جو اصلی حقدار ہوتے ہیں اس لئے کہ اصلی حقداروں کے معاملے میں نمائش اور

[illegible]



دکھاوے کا کچھ زیادہ موقع نہیں ہوتا۔ پھر منافق کی نماز کی طرح نمائش کے انفاق کا بھی کوئی تعلق اللہ تعالیٰ سے نہیں ہوتا۔ اس طرح کے لوگ خدا اور آخرت پر ایمان کے مدعی تو ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں نہ ان کا ایمان خدا پر ہوتا نہ آخرت پر۔ اور انفاق اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ معتبر ہے جو خدا اور آخرت پر ایمان کے ساتھ ہو اس لئے کہ وہی انفاق اس دنیا کیلئے بھی باعث خیر و برکت ہے اور وہی آخرت میں بھی موجب خیر و برکت ہو گا۔ جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان سے خالی ہوتے ہیں ان کا ساتھی شیطان بن جاتا ہے اور جس کا ساتھی شیطان بن جائے اس کے لئے اس بات امکان باقی نہیں رہتا کہ وہ کوئی کام خیر و برکت کا کر سکے۔

إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا ۔ ۲۷۔ بنی اسرائیل

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ آمَنُوا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللَّهُ وَكَانَ اللَّهُ بِهِمْ عَلِيمًا ۳۹

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَإِنْ تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا

یہاں تنگ دلوں اور بخیلوں کی بدقسمتی پر اظہار افسوس ہے کہ یہ اللہ اور آخرت پر ایمان اور اللہ کی راہ میں خود اسی کی بخشی ہوئی دولت کو خرچ کرنے میں بڑا خسارہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ خسارے کا سودا نہیں ہے بلکہ سرتاسر نفع ہی نفع ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ کسی کے عمل سے بے خبر ہے اور نہ وہ ذرہ برابر کسی کی حق تلفی کرنے والا ہے۔ بلکہ اگر کسی کی کوئی نیکی ہو گی تو وہ اس کو بڑھا کر کئی گنی کرے گا اور اس پر مزید وہ خود اپنی طرف سے ایک بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ۴۱ يَوْمَئِذٍ ........ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا ۴۲

[illegible]

مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اتمام حجت کا تعلق ہے اللہ نے اپنے رسولؐ کے ذریعے ان کو اپنے دین سے آگاہ کر دیا اور ان پر حجت تمام کر دی۔ اب دین و شریعت سے آگاہ کرنے کے معاملے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی ہے۔ اس اتمام حجت کے بعد بھی اگر یہ لوگ اللہ اور رسول سے منحرف ہی رہے تو آج تو یہ اپنے کفر و نفاق کو چھپا سکتے ہیں لیکن کل کو یہ کیا کریں گے جب کہ میدان حشر میں اللہ تمام امتوں اور ان کے پیغمبروں کو جمع کر کے پیغمبروں سے گواہی دلوا دے گا کہ انہوں نے لوگوں کو دین پہنچا دیا تھا اور اسی طرح کی گواہی تم (خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) اس امت کے لوگوں پر دینے کے لئے کھڑے کئے جاؤ گے۔ اس دن وہ سارے لوگ جنہوں نے کفر اور نافرمانئ رسول کا ارتکاب کیا ہو گا یہ آرزو کریں گے کاش وہ زمین میں دھنس جائیں اور زمین ان کے سمیت برابر ہو جائے۔ اس دن کوئی شخص خدا سے کوئی بات چھپا نہ سکے گا۔

"لا یکتمون اللہ حدیثا" میں نفی فعل عدم استطاعت فعل کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ کسی بات کو نہ چھپا سکنے کی وجہ یہ ہوگی کہ اس دن مجرموں کے ہاتھ پاؤں اور ان کے تمام اعضاء وجوارح خود ان کے خلاف گواہی دینے کے لئے بول اٹھیں گے۔ اس حقیقت کو قرآن نے دوسرے مقام میں یوں واضح فرمایا ہے۔

حَتّٰۤی اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَیْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ (۲۰ فصلت)

یہاں تک کہ جب وہ حاضر ہوں گے تو ان کے خلاف گواہی دیں گے ان کے کان، ان کی آنکھیں اور ان کے رونگٹے۔

یہاں اس لفظ کے اندر ایک لطیف تعریض بھی پوشیدہ ہے۔ یہ لوگ اللہ کے اس فضل کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے ان کو دے رکھا ہے ویکتمون ما آتاھم اللہ من فضلہ[۳۷] یہاں فرمایا کہ اس دن اللہ سے کوئی چیز بھی چھپا نہ سکیں گے۔ ہر چیز خود بے نقاب اور گواہی دینے کے لئے ناطق ہو جائے گی۔

یہ بات کہ انبیاء قیامت کے روز اپنی اپنی امتوں پر گواہ کی حیثیت سے کھڑے کئے جائیں گے قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے بھی ثابت ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔

یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَاۤ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ (۱۰۹۔ مائدہ)

جس دن اللہ تمام رسولوں کو جمع کرے گا اور ان سے پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب ملا وہ کہیں گے کہ ہمیں علم نہیں غیب کی باتوں کا جاننے والا تو ہے۔

یعنی اللہ تعالٰے رسولوں سے قیامت کے دن سوال فرمائیگا کہ جب تم نے اپنی اپنی امتوں کو اللہ کا دین پہنچایا تو انھوں نے دین کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ رسول جواب دیں گے کہ ہم نے تو تیرا دین بے کم وکاست لوگوں کو پہنچا دیا، انھوں نے اس دین کے ساتھ کیا معاملہ کیا اس کا علم تیرے پاس ہے اس لئے کہ غیب کا جاننے والا تو ہی ہے۔

اس شہادت کی پوری حقیقت سیدنا مسیحؑ کی شہادت سے واضح ہو جاتی ہے جو سورہ مائدہ میں یوں مذکور ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ اِنَّكَ

جب کہ اللہ پوچھے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسٰی کیا تم نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی معبود ٹھہراؤ؟ وہ جواب دیں گے کہ تو پاک ہے یہ مجھ سے کس طرح ہو سکتا ہے کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے یہ بات کہی ہوگی تو تجھ کو اس کا علم ہوگا۔ تو میرے دل



اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ (۱۱۶) مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ وَكُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ (۱۱۷)

کی باتوں کو جانتا ہے میں تیرے دل کی باتوں کو نہیں جانتا غیب کی باتوں کو جاننے والا تو ہی ہے میں نے ان سے نہیں کہی مگر وہی بات جس کا تو نے مجھے حکم دیا یہ کہ اللہ ہی کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ میں جب تک ان کے اندر رہا اسی بات کی گواہی دینے والا رہا، پھر جب تو نے مجھے وفات دی تو ان کا نگران حال تو رہا اور تو ہر چیز پر حاضر وناظر ہے۔

ساکی اس آیت سے متعلق روایات میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابن مسعودؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سناتے ہوئے جب اس آیت پر پہنچے تو حضورؐ شدت تاثر سے آبدیدہ ہو گئے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک عظیم شرف کے ساتھ ساتھ ایک عظیم ذمہ داری کی بھی حامل ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَیْدِیْكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۴۳

صلوٰۃ کے معنی نماز کے ہیں لیکن جس طرح کبھی ظرف بولتے ہیں اور مظروف اس کے مفہوم میں آپ سے آپ شامل ہوتا ہے اسی طرح کبھی مظروف اگر قرائن موجود ہوں، ظرف پر بھی مشتمل ہو جاتا ہے۔ یہاں دو قرینے موجود ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ "صلوٰۃ" کا لفظ موضع صلوٰۃ یعنی مسجد پر بھی مشتمل ہے۔ ایک تو یہ کہ فرمایا نشے اور جنابت کی حالت میں نماز کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ ظاہر ہے کہ اگر 'صلوٰۃ' سے مراد مجرد نماز ہوتی تو اس کے لئے نماز نہ پڑھو کہہ دینا کافی تھا 'لا تقربوا' کے الفاظ سے اس مطلب کو ادا کرنے کا کوئی خاص فائدہ سمجھ میں نہیں آتا۔ دوسرا یہ کہ اس کے ساتھ 'الا عابری سبیل' کا استثنا بھی ہے۔ یعنی اگر نماز کی جگہ سے مجرد گزر جانا مدنظر ہو تو اس میں مضائقہ نہیں۔ یہ 'گزر جانا' نماز کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا بلکہ اس کی واضح مناسبت ہو سکتی ہے تو موضع نماز ہی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ بعض لوگوں نے اسی عدم مناسبت سے بچنے کے لئے 'عابری سبیل' سے مراد حالت سفر کو لیا ہے لیکن یہ محض تکلف ہے۔ اول تو سفر کے لئے یہ تعبیر بالکل اجنبی سی ہے، دوسرے یہ کہ حالت سفر کے لئے جو رخصت ہے وہ اسی آیت میں 'او علی سفر' کے الفاظ سے مستقلاً بیان ہوئی ہے پھر یہاں اس کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟

'سکاری' 'سکران' کی جمع ہے 'سکران' شراب کے نشہ میں مدہوش کو کہتے ہیں۔ نشے کی حالت میں نماز

اور موضع نماز سے روک کر اسلام نے تحریم شراب کی راہ میں یہ ابتدائی قدم اٹھایا یہود کے ہاں شراب کی ممانعت صرف اوقات عبادت میں اماموں کے لئے تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس راہ میں اسلام کا پہلا قدم بھی ان کے آخری قدم سے آگے ہے۔

نشہ اور جنابت دونوں کو ایک ساتھ ذکر کرکے اور دونوں کو یکساں مفسد نماز قرار دے کر قرآن نے اس حقیقت کی طرف رہنمائی فرمائی ہے کہ یہ دونوں حالتیں نجاست کی ہیں بس فرق یہ ہے کہ نشہ عقل کی نجاست ہے اور جنابت جسم کی۔ شراب کو قرآن نے جو رجس کہا ہے یہ اس کی توضیح ہوگئی۔

"جُنُب" کا لفظ جس طرح اجنبی کے لئے آتا ہے، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے اسی طرح جنبی کے لئے بھی آتا ہے اور واحد جمع، مذکر، مونث سب میں اس کی شکل ایک ہی رہتی ہے۔

"تیمم" کے معنی قصد اور رُخ کرنے کے ہیں۔ صعید سطح ارض کو کہتے ہیں۔ مرض، سفر اور پانی نہ ملنے کی صورت میں طہارت حاصل کرنے کیلئے یہ ہدایت ہوئی کہ کوئی پاک صاف جگہ دیکھ کر چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرو۔ اگرچہ یہ مسح پاکیزگی کے حصول کے نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن اصل طریقۂ طہارت کی یاد ذہن میں قائم رکھنے کے نقطۂ نظر سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ شریعت نے اکثر عبادات میں اس امر کو ملحوظ رکھا ہے کہ اگر اصل صورت میں ان کی تعمیل ناممکن یا دشوار ہو تو تشبہی صورت میں ان کی یادگار باقی رکھی جائے تاکہ مناسب حالات میں ان کی طرف پلٹنے کے لئے طبیعت میں آمادگی باقی رہے۔

تیمم کے یہاں تین مواقع بیان ہوئے ہیں۔ مرض، سفر اور پانی کی نایابی۔ اس سے یہ بات خود بخود نکلتی ہے کہ مرض اور سفر کی حالت میں پانی کے ہوتے ہوئے بھی آدمی تیمم کر سکتا ہے۔ مرض میں چونکہ وضو یا غسل سے ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے اس وجہ سے یہ رعایت ہوئی ہے۔ اسی طرح سفر میں مختلف حالتیں ایسی پیش آسکتی ہیں کہ آدمی کو تیمم ہی پر قناعت کرنی پڑے۔ مثلاً یہ کہ پانی نایاب تو نہ ہو لیکن کمیاب ہو، اندیشہ ہو کہ اگر غسل وغیرہ کے کام میں لایا گیا تو پینے کے لئے پانی ختم ہو جائے گا یا یہ ڈر ہو کہ اگر نہانے کے اہتمام میں لگے تو قافلے کے ساتھیوں سے بچھڑ جائیں گے، یا ریل اور جہاز کا ایسا سفر ہو کہ غسل کرنا شدید زحمت کا باعث ہو۔

نجاست کی یہاں دو حالتیں مذکور ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ او جاء احد منکم من الغائط (یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے) الغائط "اصلاً" نشیبی زمین کے لئے آتا ہے۔ یہاں یہ قضائے حاجت سے کنایہ ہے اس لئے کہ سادہ دیہاتی زندگی میں لوگ رفع حاجت کیلئے عموماً نشیبی زمینوں اور جھاڑیوں ہی میں جاتے ہیں۔ دوسری او لامستم النساء (یا تم نے عورتوں سے ملاقات کی ہو) "ملامست" کے معنی اصلاً چھونے اور ہاتھ لگانے کے ہیں لیکن یہاں یہ کنایہ مباشرت سے۔ نجاست کی ان دونوں حالتوں کے ذکر سے مقصد یہ ہے کہ تیمم ہر قسم



کی نجاست میں کفایت کرتا ہے۔ اگر یہ وضاحت نہ ہوتی تو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ معمولی حدث میں تو تیمم جائز ہے لیکن دوسری صورتوں میں جائز نہیں ہے۔

اجزا کی وضاحت کے بعد اب آیت کے موقع اور اس کے نظم کو ایک مرتبہ پھر سمجھ لیجئے آیت ۳۶ میں اللہ ہی کی عبادت اور والدین و اقربا وغیرہ کے ساتھ احسان و انفاق کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ جو چیزیں عبادت اور احسان و انفاق کو باطل کر دینے والی ہیں مثلاً شرک اور ریا وغیرہ ان کا ذکر فرمایا اب یہ عبادت الٰہی کے سب سے بڑے مظہر نماز کے ان مفسدات کا ذکر فرمایا جو نماز کو باطل کر دینے والے ہیں۔ اوپر شرک کا ذکر ہو چکا ہے جو عقائد کی نجاست ہے اس آیت میں ظاہری نجاستوں اور ان کے ازالہ کی تدابیر کی طرف رہنمائی فرمائی۔ فرمایا کہ نشے اور جنابت کی حالت میں نماز اور جائے نماز کے پاس نہ جاؤ۔ نشے کی حالت "یہ" جب کہ آدمی کو کچھ ہوش نہیں کہ زبان سے کیا کلمات نکل رہا ہے اور کس کام کے کرنے اور نہ کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ نماز پڑھنا ایک کار عبث ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ آیت اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب شراب کی قطعی حرمت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ اس حکم نے گویا لوگوں کو متنبہ کر دیا کہ اب شراب کی قطعی حرمت کے لئے لوگ اپنی تربیت کریں۔ اسی طرح منع فرمایا کہ جنابت کی حالت میں بھی نماز اور جائے نماز کے پاس نہ جاؤ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جس طرح شراب کا نشہ مبطل نماز ہے اسی طرح جنابت کا کسل اور انقباض بھی اس انشراح اور حضور قلب کے منافی ہے جو نماز کے لئے مطلوب ہے۔ اس ممانعت کے ساتھ اتنا استثنا کر دیا کہ اس حالت میں کوئی شخص اگر کسی ضرورت سے نماز کی جگہ سے گزر جانا چاہے تو اس کی رخصت ہے۔ جنابت کے لئے طہارت غسل ہے لیکن اگر کوئی شخص بیمار یا سفر میں ہے یا اسے پانی نہیں مل رہا ہے تو وہ تیمم کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ قضائے حاجت اور مباشرت کا ذکر اس لئے فرمایا کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ تیمم ہر قسم کی نجاست میں جائز ہے۔ تیمم کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ کوئی پاک جگہ دیکھ کر چہرے اور ہاتھوں کا مسح کر لو آخر میں فرمایا کہ اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔ یعنی بندوں کے ساتھ اس نے یہ جو رعایت فرمائی ہے تو اس لئے کہ وہ عفو اور غفور ہے۔

---


مشرقی پاکستان میں "میثاق" مندرجہ ذیل مقامات سے حاصل ہو سکتا ہے۔

ڈھاکہ:- ظفر اینڈ کمپنی، ۲- نواب پور روڈ، ڈھاکہ۔

چاٹگام:- ایس ایم الیاس، ۵۰- ایم- اے جناح روڈ چاٹگام

افادات فراہیؒ

خالد مسعود

# اسالیب قرآن

—۲—

## ۷۔ جہت خطاب کی تبدیلی

کلام کے سمجھنے کے لئے خطاب کو پہچاننا بہت ہی اہم کام ہے۔ یہ تعین کرنے میں کہ خطاب کس کی طرف سے ہے اور کس سے ہے، علماء کے درمیان بہت اختلاف ہوا ہے۔ پس لازم ہے کہ خطاب کی تبدیلی کے اصول معلوم کئے جائیں۔

جب خطاب واحد سے ہوتا ہے اور وہاں کوئی واضح قرینہ موجود نہیں ہوتا، عام مفسرین اس کا مخاطب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات کو لے لیتے ہیں۔ یہ چیز انہیں بہت بڑی غلطی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ درحقیقت ایسے موقعوں پر کبھی تو نبی کو اس لئے مخاطب کیا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کا امام اور ان کی زبان ہوتا ہے، اصل مخاطب عام لوگ یا ان کا کوئی خاص گروہ ہوتا ہے اور کبھی کلام مستقل طور پر لوگوں ہی سے ہوتا ہے، نبی سرے سے مخاطب ہی نہیں ہوتا۔ اول الذکر کی مثال سورہ انعام کی ذیل کی آیات ہیں۔

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۶۶، ۶۷)

اور اس کو تمہاری قوم نے جھٹلایا حالانکہ یہ حق ہے کہہ دے کہ میں تم پر داروغہ نہیں، ہر خبر کا ایک مقرر وقت ہے، عنقریب تم جان لوگے۔

اس آیت میں مخاطب واحد ہے اور اس سے مراد نبیؐ کی ذات ہے۔ اس کے بعد کی آیت میں مخاطب تو واحد ہی رکھا ہے مگر مراد اس سے امت ہے۔ فرمایا۔

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۶۸)

اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات کا مذاق اڑا رہے ہوں تو ان سے رخ پھیرلے تاآنکہ وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں اور اگر تجھے شیطان کبھی بھلا ہی دے تو یاد آنے کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھنا۔

یعنی تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ ان لوگوں کو خدا کی آیات کے ذریعے یاد دہانی کرتے رہو۔ پھر جب یہ کج بحثی پر اتر آئیں تو ان سے اعراض کرو گویا مسلمانوں پر یہاں دو چیزیں واجب کیں، ایک تذکیر اور دوسری اعراض



اسی مضمون کو آگے کھول بھی دیا ہے۔

وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (۶۹)

اور متقین پر ان کافروں کے حساب کی کوئی ذمہ داری نہیں، البتہ یاد دہانی کی ذمہ داری ضرور ہے تاکہ وہ بھی بچیں۔

یعنی ظالمین کے حساب میں اگر اہل ایمان کی کوئی ذمہ داری ہے تو وہ بس نصیحت و یاد دہانی تک محدود ہے۔ اگر انہوں نے یہ فرض ادا کر دیا تو ان کی قوم کے کفر کے بارے میں خدا ان سے کوئی محاسبہ نہ کرے گا۔ اگر اہل ایمان اپنی ذمہ داری ادا کرکے اس قوم سے الگ ہو گئے تو وہ ان کی شامت اعمال سے بری قرار دیے جائیں گے۔

رہا یہ سوال کہ آیات ۶۸ میں واحد کے خطاب سے امت مراد لینے کی دلیل کیا ہے تو اس کا ثبوت خود سورۂ نساء میں موجود ہے۔ وہاں فرمایا ہے۔

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ (۱۴۰)

اور اس نے کتاب میں یہ حکم اتارا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا انکار اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو ان لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو تاآنکہ وہ اس کے علاوہ کسی بات میں مشغول ہو جائیں۔ اگر بیٹھو گے تو تم بھی انہی کی طرح ہو گے۔

یہاں جس حکم کی طرف اشارہ کیا ہے وہ وہی ہے جو سورہ انعام کی مذکورہ آیات میں بیان ہوا ہے، کیونکہ اس کے سوا قرآن مجید کی کوئی آیت اس مضمون کی حامل نہیں ہے۔ اسی وجہ سے بعض مفسرین کا یہ خیال ہوا کہ سورہ انعام کی مذکورہ آیت سورۂ نساء کی اس آیت سے منسوخ ہو گئی ہے۔ حالانکہ حقیقت میں دیکھا جائے تو دونوں آیتیں ایک ہی مضمون کی حامل ہیں اور نسخ کا کوئی موقع نہیں۔

خطاب بواسطۂ نبی کی دوسری مثال سورۂ ہود کی آیات ہیں۔ فرمایا۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (۱۱۲، ۱۱۳)

جیسا تجھے حکم دیا گیا ہے تو اور وہ جنہوں نے تیرے ساتھ توبہ کی قائم رہیں اور تم سرکشی نہ کرنا، بے شک وہ دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو اور ظالموں کی طرف مائل نہ ہونا کہ تمہیں آگ چھوئے

اس میں وَلَا تَطْغَوْا سے آگے خطاب لوگوں سے اور امت سے ہے، اگرچہ نبی کو واسطہ بنایا گیا ہے۔ ثانی الذکر اسلوب جہاں خطاب تو واحد سے ہو مگر نبی کے واسطے کے بغیر اس کا رخ لوگوں کی طرف ہو

مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (بقرہ ۱۰۵-۱۰۷)

مشرکین نہیں چاہتے کہ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے کوئی رحمت نازل ہو اور اللہ اپنی رحمت کیلئے خاص کرتا ہے جن کو چاہتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ جو کوئی آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اس کو نظر انداز کراتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے مانند دوسری لاتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے؟ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے اور تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی دوست ہے اور نہ مددگار۔

ان آیات میں بھی الم تعلم کا خطاب نبی کے واسطہ کے بغیر لوگوں سے ہے۔ سورۃ الحاقہ کی آیت

فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَى

تو دیکھتا قوم کو اس میں گرے پڑے

میں بھی خطاب عام ہے۔ گویا مطلب یہ ہے کہ اے مخاطب اگر تو وہاں ہوتا تو یہ دیکھتا۔ اسی طرح التین کی آیت

فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ (۷-۸)

سو اب کیا ہے جس سے تو جزا کو جھٹلاتا ہے کیا خدا سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں؟

میں بھی خطاب عام ہے۔

**۸- التفات** جہت خطاب کی تبدیلی کی ایک قسم التفات ہے۔ قرآن کی حیثیت چونکہ ایک آسمانی خطیب کی ہے جو تمام اہل زمین سے مخاطب ہے۔ اس لئے اس کا طریقہ یہ ہے کہ دائیں بائیں ہر طرف دیکھ کر تمام لوگوں سے خطاب کرتا ہے۔ اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں بکثرت ہیں۔ سورہ نحل کا ایک موقع ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ

تجھ سے پہلے ہم نے نہیں بھیجا مگر آدمیوں ہی کو جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے

یہاں خطاب نبیؐ سے ہے۔ اس کے بعد لوگوں کی طرف التفات کر کے فرمایا ہے۔

فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ

اگر تم واضح دلیلوں اور صحیفوں کا علم نہیں



عموماً نبیؐ سے خطاب سے پہلے یا اس کے فوراً بعد التفات کے طریقہ پر آتا ہے۔ جو لوگ زیادہ فکر کے عادی نہیں ہوتے یا اصل مادہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے اور ضمیروں کے انتشار سے گھبرا جاتے ہیں، وہ ایسے مواقع پر بسا اوقات الجھن میں پڑ جاتے ہیں حالانکہ التفات کے موقع پر ضمیروں کے مرجع کے اختلاف میں کوئی حرج نہیں ہوتا اس اسلوب کی مثال سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ فرمایا۔

وَقَضَى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا (۲۳)

اور تمہارے رب نے حکم دیا کہ عبادت نہ کرو مگر اسکی اور والدین کے ساتھ احسان کا سلوک کرو۔ اگر تمہارے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں اُف کہو اور نہ جھڑکی دو — اور ان سے شریفانہ بات کرو۔

اس آیت کے سیاق میں جو مضامین بیان ہوئے ہیں ان میں واحد و جمع دونوں طرح سے خطاب آیا ہے لیکن مراد اس سے عموم ہی ہے۔ یہ بات کسی ایسے شخص پر مخفی نہیں رہ سکتی جو یہ جانتا ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین زندہ نہ تھے کہ انہیں ان کے ساتھ احسان کا سلوک کرنے کی ہدایت کی جاتی۔

مذکورہ آیت میں تو خطاب کے عام ہونے کی واضح دلیل موجود ہے مگر قرآن شریف میں ایسی آیات بھی ہیں جن میں کوئی قاطع دلیل تو موجود نہیں البتہ اگر آدمی کو اسالیب کلام کا علم ہو اور وہ حسنِ تادیل کی معرفت رکھتا ہو تو اس کا فہم خود بخود حقیقت کی طرف رہنمائی کرے گا۔ ایسی آیات کی مثال یہ ہے۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ وَاللَّهُ أَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوا أَتُرِيدُونَ أَنْ تَهْدُوا مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا (نساء ۸۸)

تمہیں کیا ہوا ہے کہ منافقوں کے بارے میں دو گروہ ہو رہے ہو حالانکہ اللہ نے ان کے کرتوتوں کے سبب ان کو اوندھا کر دیا۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ان کو رستے پر لے آؤ جنہیں اللہ نے گمراہ کر دیا۔ جس شخص کو اللہ گمراہ کر دے تم اس کے لئے کبھی رستہ نہ پاؤ گے۔

یہاں لن تجد لہ میں خطاب عام ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ مَا يَوَدُّ

اے ایمان والو تم راعنا نہ کہا کرو، انظرنا کہا کرو۔ اور توجہ سے سنا کرو۔ کافروں کیلئے دردناک عذاب ہے۔ جن لوگوں نے کفر کیا، اہل کتاب ہوں یا

لَا تَعْلَمُوْنَ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ

رکھتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔

اس کے بعد پھر نبی کی طرف التفات ہے۔ فرمایا

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (نحل ۴۳-۴۴)

اور تیری طرف بھی ہم نے ذکر اتارا ہے تاکہ تو لوگوں کے لئے ان باتوں کو واضح کرے جو ان کی طرف اتاری گئیں اور تاکہ وہ غور کریں

یہ مضمون سورہ یونس میں بھی بیان ہوا ہے۔ فرمایا۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ (۹۴)

اگر تمہیں اس کے بارے میں شک ہو جو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لو جو تم سے پہلے سے کتاب پڑھتے رہے ہیں

سورہ نحل کی آیت میں اس مضمون کو جمع کے صیغے سے بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کتاب کا نزول جس طرح نبی پر ہوتا ہے اسی طرح یہ امت پر بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ اعراف میں فرمایا

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۔

پیروی کرو اس کی جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا۔

اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالٰے خاص نبیؐ ہی سے مخاطب نہیں ہوتا کہ اس کے واسطے ہی سے وہ لوگوں سے بات کرے۔ متعدد آیات ایسی ہیں جن میں کلام کا رخ واضح طور پر لوگوں کی طرف ہے۔ مثلاً سورہ مائدہ میں ہے

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ الخ

اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آچکا جو تمہارے لئے کھول کر بیان کر رہا ہے۔

اس آیت میں قل یا ایہاالنبی کے الفاظ کو حذف ماننے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اہل کتاب سے بلا واسطہ خطاب ماننا ہی زیادہ بلیغ ہے۔ جہاں کہیں مقصود یہ رہا ہے کہ نبی ان سے کوئی بات کہے تو وہاں اس کی تصریح کردی گئی ہے اور "قل" یا "قل" کے الفاظ آئے ہیں۔ پس التفات کے مواقع پر حذف ماننے اور ظاہر شکل سے کلام کو پھیرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

اس بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ قرآن نبی علیہ السلام سے بھی خطاب کرتا ہے اور لوگوں سے بھی بلا واسطہ خطاب کرتا ہے۔ سورۂ مزمل میں دیکھئے۔ شروع سورہ میں خطاب نبی کی ذات سے ہے مگر آگے التفات عام لوگوں سے ہے۔



اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (۱۵)

بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک رسول گواہ بنا کر بھیجا ہے جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا۔

اسی طرح قرآن مجید کی کتنی آیات ہیں جو یا ایھا الذین آمنو اور یا ایہا الناس کے الفاظ سے شروع ہو رہی ہیں یا ان میں صیغہ جمع استعمال کرکے اصل حقیقت کی تصریح کردی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ [اعراف ۳]

پیروی کرو اس کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے اور اس کے سوا اور حمائیتیوں کی پیروی نہ کرو۔ کم ہی ہے جو تم یاد دہانی حاصل کرتے ہو۔

یہاں تک تو بحث اس امر سے متعلق تھی کہ خطاب کا رخ کس سے ہے۔ رہا یہ سوال کہ خطاب کا مصدر کون ہے، تو اس کی پہچان بھی بہت اہم ہے۔ قرآن مجید تمام تر اللہ تعالٰے کی طرف سے وحی ہونے کے باوجود پورے کا پورا لسان الٰہی پر نازل نہیں ہوا۔ اس کا کچھ حصہ دعا کی شکل میں ہے جس کی تعلیم اللہ تعالٰے نے اپنے بندوں کو دی ہے مثلاً سورۂ فاتحہ۔ اس میں مخلوقات کے اقوال کے حوالے بھی دیے گئے ہیں، جو مومن و کافر اور ملائکہ و انسان میں سے کسی کے بھی ہو سکتے ہیں۔ ایسے مواقع پر جہاں کہیں تصریح کردی گئی ہے وہاں تو کلام میں کوئی اینچ پیچ نہیں ہے لیکن بعض مواقع ایسے بھی ہیں جن میں خطاب کے مصدر کی تصریح نہیں کی گئی اور اسے موقع کلام اور حسن تاویل ہی کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ ان مواقع میں کلام بہت غور و فکر کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ ایک غافل آدمی بات کو گڈمڈ کرکے اللہ تعالٰے سے وہ باتیں منسوب کر سکتا ہے جو اس کی جلالت شان کے منافی ہیں۔

التفات کی ایک قسم کو عموماً حذف متصور کیا جاتا ہے حالانکہ وہ التفات ہے۔ اس کی مثالیں یہ ہیں

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰۗىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۔ (بنی اسرائیل ۱۳-۱۴)

ہر انسان کی کمائی ہم نے اس کے گلے میں ڈال رکھی ہے اور قیامت کے دن ہم اس کے لئے ایک دفتر نکالیں گے جس کو وہ کھلا ہوا پائیگا۔ پڑھ اپنا اعمال نامہ آج تو خود ہی اپنا حساب لینے کے لئے کافی ہے۔

یہاں اقرا سے پہلے قیل لہٗ وغیرہ کے الفاظ محذوف نہیں بلکہ اس لفظ سے التفات شروع ہوتا ہے۔

وَوَقَاهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ۝ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ.
اور ان کے رب نے انہیں دوزخ کے عذاب سے بچا لیا کھاؤ پیو۔ رچتا پچتا اپنے عملوں کے بدلے

یہاں بھی کلوا سے پہلے کوئی حذف نہیں۔

## التفات کے فائدے

قرآن مجید یا کلام عرب میں التفات کے اسلوب کی کثرت بلا وجہ نہیں ہے۔ اس کا عام فائدہ سامع کا انتباہ ہے۔ انسان کی فطرت ایسی ہے کہ یہ اپنی غفلت اور بلادت کی وجہ سے بعض ایسے امور کی طرف بھی متوجہ نہیں ہوتا جو بالکل اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں۔ ہاں اگر اس کی اپنی کوئی غرض اور حاجت ان سے وابستہ ہو تو پھر ان کی طرف توجہ کرتا ہے۔ یہی چیز جب اس کے اندر پختہ ہو جاتی ہے تو اس کی عادت بن جاتی ہے۔ التفات کی کثرت کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ یہ انسان کے جمود کو توڑتا ہے اور اسے غور و فکر کے لئے تیار کرتا ہے۔

التفات کے اس عام فائدے کے علاوہ اس کے کچھ خاص فائدے بھی ہیں جن میں سے بعض کو ہم بیان کریں گے۔

۱۔ مدح کے موقع پر کبھی کبھی کلام غائب کے صیغہ سے شروع ہوتا ہے اور بعد میں حاضر کی طرف مڑ جاتا ہے۔ اس سے مقصود مخاطب کی قدر و منزلت کو بڑھانا ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں عرب کے قصائد میں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں کعب ابن زہیر کے قصیدہ میں یہی اسلوب استعمال ہوا ہے۔ سورۂ فاتحہ کی ترتیب بھی یہی ہے اور پہلے غائب اور پھر حاضر کے صیغے میں مدح کے بعد دعا کی گئی ہے۔ غائب کی مدح تعظیم و اخلاص کے پہلو سے زیادہ مناسب ہوتی ہے۔ اس سے متکلم اور سامع کو شرمندگی نہیں ہوتی اور یہ اسلوب آگے آنے والے اس مضمون سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے جس میں مدح نہیں ہوتی۔ یہ چیز کعب کے مذکورہ قصیدہ اور اعشیٰ کے قصیدہ میں بھی ہے۔

جھڑکی اور زجر و توبیخ کے موقع پر بھی غائب کا صیغہ زیادہ مناسب اور سہل ہوتا ہے۔ حاضر کا صیغہ غصے کی شدت پر دلیل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب جھڑکی سے سامع کے بدک جانے کا احتمال ہو تو اس کے بیان کے انداز مختلف استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً کبھی غیر سے خطاب کیا جاتا ہے۔ کبھی کسی ایسے قصے کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے جو اس شخص کے حال سے ملتا جلتا ہوتا ہے جس کو جھڑکی دینا مقصود ہے اور کبھی ایک شخص کی بجائے جماعت کو مخاطب کیا جاتا ہے۔ پہلے اسلوب کی مثال سورہ عبس میں ہے۔

أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ فَأَنتَ لَهُ تَصَدَّىٰ (۵-۶)
جو بے پرواہی کرتا ہے اس کے تو تو پیچھے پڑا ہے



دوسرا موقع ہے۔

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا (مدثر ۱۱)
مجھے اور جسے میں نے پیدا کیا، تنہا چھوڑ دے۔

ان آیتوں میں اگرچہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مگر جھڑکی کا اصل رخ کفار کی طرف ہے۔ اسی طرح فرعون کے قصہ میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے بات کرتے کرتے اس نے اپنے لوگوں کی طرف التفات کیا اور کہا

إِنَّ رَسُولَكُمُ الَّذِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ (الشعرا ۲۷)
تمہارا پیغمبر جسے تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، تو دیوانہ ہے۔

پھر جب وہ زیادہ غضبناک ہو گیا تو اس نے حضرت موسیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

لَئِنِ اتَّخَذْتَ إِلَٰهًا غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ (۲۹)
اگر تو نے میرے سوا کسی کو معبود بنایا تو میں ضرور تجھے قیدیوں میں داخل کر دوں گا۔

دوسرے اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں بکثرت ہیں اور مختلف پہلوؤں سے آئی ہیں۔ تیسرے اسلوب کی مثال ذیل کی آیت ہے۔

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ (انفطار ۶)
اے انسان تجھے اپنے فیاض رب کے بارے میں کس چیز نے دھوکے میں رکھا۔

ان اسالیب کے ذریعے تمہید اٹھانے کے بعد عموماً خطاب اسی سے ہونے لگتا ہے جس کی طرف جھڑکی کا اصل رخ ہوتا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ میں پہلے بنی اسرائیل کے احوال کا ذکر کیا، پھر ان کے متعلق کچھ تمثیلیں بیان کیں، پھر عمومی خطاب ہوا اور اس کے بعد خود بنی اسرائیل ہی کو مخاطب کیا۔ ان تمہیدی بیانوں میں بھی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس گروہ سے خطاب ہونے والا ہے اس اسلوب کی مزید وضاحت کے لئے سورۂ الحجر دیکھئے۔

۲۔ التفات کا ایک فائدہ یہ ہے کہ یہ بعید کو حاضر کر دیتا ہے اور اس کے نتیجے میں دل میں اس کی وقعت زیادہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً آیات ذیل میں ان منکم الا ــــ الخ کا اسلوب دیکھئے۔ فرمایا

وَيَقُولُ الْإِنسَانُ أَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ
اور انسان کہتا ہے کیا جب میں مر چکا ہوں گا تو زندہ نکالا جاؤں گا کیا انسان یاد نہیں کرتا کہ ہم نے پہلے بھی اس کو پیدا کیا حالانکہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔ تمہارے پروردگار کی قسم ہم انہیں اور شیطانوں

وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ
جَهَنَّمَ جِثِيًّا ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ
كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ
عِتِيًّا ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ
هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا وَاِنْ
مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى
رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا
(مریم ۶۸ - ۷۲)

کو ضرور اکٹھا کریں گے اور جہنم کے گرداگرد گھٹنوں کے بل حاضر کریں گے۔ پھر ہر جماعت میں سے ہم اس شخص کو نکال لائیں گے جو رحمان کے مقابل میں سب سے زیادہ سرکش تھا پھر ہم ان لوگوں کو بھی خوب جانتے ہیں جو جہنم میں داخل ہونے کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ بیشک تم میں سے ہر ایک اس پر پہنچنے والا ہے یہ تیرے رب پر ایک لازمی بات اور طے شدہ امر ہے۔

یہاں انسان سے مراد منکرین ہیں اور ان منکم کا خطاب بھی انہی سے ہے۔

۳۔ غائب سے حاضر کی طرف التفات کا ایک فائدہ شدت خطاب ہے یہ اسلوب اس بات پر دلیل نہیں ہوتا کہ مخاطب واقعی اس بات کو سن بھی رہا ہے بلکہ صرف متکلم کی شدت اس سے ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً فرمایا۔

آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (یونس ۹۱)

کیا اب ہے؟ تو تونافرمانی کرتا رہا اور فسادیوں میں سے رہا۔

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے میدان میں اصحاب قلیب کو مخاطب کیا تو غائب کے لئے حاضر کا صیغہ استعمال کیا۔ اس کا فائدہ بھی یہی شدت خطاب ہے۔

۴۔ التفات کا ایک موقع سامع کی طرف سے رخ پھیر لینا بھی ہوتا ہے اور مقصد اس سے اس کی تحقیر ہوتی ہے۔

۵۔ التفات کے ذریعے بسا اوقات ان لوگوں کا ذکر کنایۃً کیا جاتا ہے جن سے اگر بات صاف صاف کہی جائے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کا انکار کر دیں گے یا سخت ناگواری محسوس کریں گے۔ اس کی مثال سورۃ بقرہ کی ابتدا میں ہے جہاں یہود کے نفاق اور باطل پر اڑے ہوئے کفار کا ذکر کیا ہے مگر ان سے خطاب نہیں کیا۔

۶۔ اس اسلوب کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی سخت خطاب کا رخ عام لوگوں سے پھیر کر ان کے لیڈر کی طرف کر دیا جاتا ہے تاکہ اس کی تاکید ہو جائے۔ چنانچہ کئی مقامات میں نبی صلعم کو اسی غرض سے مخاطب کیا ہے۔ حالانکہ دوسری جگہوں پر ان کو سامعین میں داخل کیا گیا ہے۔ (باقی)

---



مقالات

ڈاکٹر محمد وصی اللہ خاں۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر ادارہ تحقیق و تعلیم۔ نیو کیمپس پنجاب یونیورسٹی لاہور

# تعلیم اور معاشرہ

یہ مقالہ 'مجلس تعلیمات پاکستان' کی ماہانہ نشست میں پڑھا گیا۔

زمانہ قدیم سے تعلیم کا مقصد طلبہ کے طرز فکر و عمل میں تبدیلی لانا فرض کیا گیا ہے۔ ایسی تبدیلی جو معاشرہ کے مقاصد سے ہم آہنگ ہو یوں تو نئی نسلوں کو پروان چڑھا کر اس قابل بنانا کہ بالغ ہو کر معاشرہ میں کامیاب زندگی گزار سکیں، روز اول سے انسان کی ذمہ داری رہی لیکن جب انسانی زندگی نسبتاً سادہ تھی تہذیب و ثقافت کی پیچیدگیوں نے ضروریات کا حصول اتنا مشکل نہیں بنا دیا تھا جتنا آج ہے تو بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری براہ راست والدین اٹھاتے تھے چنانچہ حصول معاش کی تعلیم والد کے سپرد تھی۔ کسان اپنے بیٹے کو کامیاب کسان، دھوبی اپنے بیٹے کو کامیاب دھوبی اور موچی اپنے بیٹے کو کامیاب موچی بننے میں مدد دیتا تھا اور سیرت و کردار کی تربیت والدہ کے ذمہ تھی۔ بلاشبہ اس وقت بھی افرادی اخلاقی تربیت کا کام چند بزرگ افراد انجام دیتے تھے جو دنیاوی مال و متاع کے حصول سے زیادہ اس اعلیٰ مقصد کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا کر ایثار پسند اور یکسو زندگی گزارتے تھے مگر معاشرہ میں فنی اعتبار سے کوئی ایسا گروہ موجود نہیں ہوتا تھا جس کے معاش کا انحصار ہی بچوں کو تعلیم دینے پر ہو۔

رفتہ رفتہ انسانی تہذیب کی پیچیدگی جوں جوں بڑھتی گئی والد کے لئے یہ ممکن نہ رہا کہ اپنے بچہ کو حصول معاش کی تعلیم کما حقہٗ دے سکے (جب کہ بچوں کے لئے اپنے باپ کا پیشہ اختیار کرنا بھی لازم نہیں رہا) اور والدہ کے لئے یہ بات آسان نہیں رہی کہ اولاد کی سیرت کی تربیت زیادہ تر اپنے ذمہ ہی رکھے۔ افراد کے لئے ایک ایسے گروہ کی تیاری رفتہ رفتہ ضروری ہوتی گئی جس کا اصل کام ہی بچوں کو تعلیم دے کر کامیاب زندگی بسر کرنے کے قابل بنانا ہو چنانچہ عمل تعلیم جاری رکھنے کے لئے ضروری سہولتوں پر مشتمل ایک معاشرتی ادارہ وجود میں لایا گیا جسے ہم مدرسہ یا اسکول کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور فرق مراتب کی خاطر اس کے اور بھی بہت سے نام ہم نے وضع کر لئے ہیں۔ مثلاً کالج۔ یونیورسٹی۔ اکادمی۔ انسٹی ٹیوٹ وغیرہ۔ مدرسہ (تعلیم گاہ) کا قیام جہاں اس مفروضہ پر مبنی تھا کہ بچے تعلیم پا کر کامیاب بالغ زندگی گزارنے

کے قابل ہو سکیں گے۔ وہاں انسانوں کی یہ آرزو بھی اس معاشرتی ادارہ کے قیام میں کارفرما تھی کہ تعلیم کے ذریعہ جو نئے بالغ افراد تیار ہوں گے وہ موجودہ بالغ افراد سے بہتر ہوں گے اور اس طرح انسانی تمدن ترقی کرے گا۔ پس جہاں بہتری اور ترقی کے تصورات کارفرما تھے وہاں معاشرہ کے مقاصد اور منازل بھی عمل تعلیم کی رہبری کے لئے متعین کئے جاتے تھے تاکہ یہ عمل معاشرہ کی تعمیر نو کا ذریعہ بن سکے اور جو کچھ انسانوں کو اب حاصل نہیں ہے مستقبل میں حاصل ہو سکے۔ چنانچہ مذہب اور دوسرے تمام اصلاحی ادارے تعلیم گاہوں کے پشتیبان بن گئے اور عمل تعلیم کے ذریعہ زندگی ان سانچوں میں ڈھلنے لگی جن میں یہ ادارے اسے ڈھالنا چاہتے تھے۔ مذہب، اخلاق اور تعلیم کا تعلق اسی لئے نہایت قدیم زمانے سے قریب رہا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ تعلیم معاشرہ کی بقا اور تعمیر کا ذریعہ سمجھی گئی اور معاشرتی تغیر یا اصلاح کے جو تصورات مختلف فلسفوں اور نظریوں کی شکل اختیار کرتے تھے ان کو عملی جامہ پہنانا تعلیم گاہوں کے ذمہ تھا۔ جان ڈیوی نے فلسفہ کی تعریف بھی اسی انداز میں کی کہ فلسفہ تعلیم کی نظریاتی صورت کا نام ہے۔

ماہرین تعلیم اس بات میں متفق نظر نہیں آتے کہ آیا تعلیم معاشرہ کی مقلد ہے یا رہنما؟ جو لوگ تقلید کے قائل ہیں ان کا کہنا ہے کہ تعلیم نئی نسلوں کو ایسی زندگی کے لئے تیار کرے جسے معاشرہ میں کامیاب کہا اور سمجھا جاتا ہو۔ اس کا کام کامیاب زندگی کے نئے معیار متعین کرنا نہیں ہے۔ معاشرہ تمدن کے ارتقائی مدارج سے جس طرح گذرتا جائے تعلیم کے نئے مقاصد متعین کرتا جائے گا اور معلم انہی مقاصد کے مطابق نظام تعلیم کو بدلتے اور درست کرتے جائیں گے۔ مثلاً ان میں سے بعض لوگوں کا انداز فکر یہ ہے کہ انسانی فطرت میں جستجو اور تحقیق کا شوق خلقی اعتبار سے ودیعت کیا گیا ہے جب بعض افراد نئی ایجادات کے ذریعہ فطرت کی طاقتوں پر غلبہ حاصل کرتے ہیں تو نہ صرف پیدائش دولت اور تقسیم دولت کے طریقے بدل جاتے ہیں بلکہ معاشرتی زندگی نئے تقاضوں کا ساتھ دینے میں پیچھے رہ جاتی ہے۔ تعلیم کا کام یہ ہے کہ معاشرتی تغیر کی رفتار تیز رکھے تاکہ معاشرہ علمی اور سائنسی ترقی کے نئے تقاضوں کا پوری طرح ساتھ دے سکے۔ اس نظریہ کے برعکس بعض دوسرے ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ یہ تبدیلی لازمی طور پر حیات آفریں اور تعمیری نہیں ہوتی اس لئے علمی اور سائنسی تحقیق اور ایجادات کے ذریعہ پیدائش دولت کے طریقوں میں جو تغیر واقع ہوتا ہے تعلیم اس کے معاشرتی اور اخلاقی عواقب سے بے نیاز ہو کر اندھا دھند معاشرتی تغیر کے لئے کام نہیں کر سکتی۔ معاشرہ کے مجموعی مقاصد کا تعین تعلیم کا کام ہے اور جو معاشرتی تبدیلی تعلیم کے ذریعہ آئے اسے لازمی طور پر ان مقاصد سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔

یہ دونوں انداز فکر بہرحال تعلیمی مقاصد اور معاشرتی مقاصد کے لازمی تعلق کا اعتراف ضرور کرتے



ہیں اس لئے جب ہم کسی قوم کے نظام تعلیم کا تجزیہ کریں اور اس کے مقاصد متعین کرنے کی کوشش کریں تو اس قوم کے نظریہ حیات اور فلسفہ معاشرت کو نظر انداز کر کے کوئی بات طے کرنا ممکن نہیں ہو سکتا۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے تعلیم کا مقصد طلبہ کے طرز فکر و عمل میں اچھی تبدیلی لانا بتایا جاتا ہے اور جوں جوں انسانی تمدن زیادہ پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے تعلیم کے دو بڑے مقاصد زیادہ واضح طور پر سامنے آ رہے ہیں۔ اوّلاً یہ کہ طالب علم کو بہتر کسب معاش کے قابل بنایا جائے اور دوسرے یہ کہ اس کی شخصیت اور کردار میں نظر و مقاصد حیات کے مطابق تبدیلی لائی جائے۔ مثال کے طور پر پاکستانی معاشرہ میں متعلمین کی بہت بڑی اکثریت اب محض اس لئے تعلیم حاصل نہیں کرتی کہ وہ تعلیم کے ذریعہ زیادہ مہذب زندگی گذار سکے بلکہ اس کے سامنے تعلیم کے ذریعہ حصول معاش کے بہتر طریقے سیکھنا اور اختیار کرنا زیادہ واضح طور پر رہتا ہے۔ محض اخلاقی اصلاح و تہذیب تعلیم کا مقصد نہیں رہی جیسا کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے سمجھی جاتی تھی۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے زمانہ آغاز میں جو مسلمان طلبہ وہاں تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے ان میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی تھی جو اگر تعلیم حاصل نہ کرتے تو ان کی معاشی حالت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا تھا۔ زمینداروں اور جاگیرداروں کے بیٹے تعلیم کو ایک زیور سمجھ کر حاصل کرتے تھے تاکہ زیادہ مہذب اور متمدن سمجھے جائیں۔ آج اس کے برعکس تعلیم کا حصول زیادہ تر کسب معاش کے تقاضوں کے پیش نظر کیا جاتا ہے اور جو لوگ تعلیم حاصل نہیں کرتے ان کا معاشی مستقبل بیشتر حالات میں تاریک سمجھا جاتا ہے یہ نظریہ ملک کے اقتصادی حالات میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں ان کی وجہ سے زیادہ مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ آئیے ان تبدیلیوں کا جائزہ زیادہ گہرائی میں جا کر لیں۔

اقتصادی اعتبار سے ایک قدیم اور پسماندہ معاشرہ وہ ہوتا ہے جہاں پیدائش دولت کے وسائل محدود ہیں اور فی کس آمدنی میں قابل ذکر تبدیلی ممکن نہ ہو۔ ایسے معاشرہ میں مثلاً قابل کاشت زمین کا بیشتر حصہ چند خاندانوں کی ملکیت میں رہتا ہے اور آبادی کی کثرت مزارع ہوتی ہے۔ کاشتکاری کے قدیم طریقوں کی وجہ سے فی ایکڑ پیداوار میں قابل ذکر اضافہ ممکن نہیں ہوتا۔ زراعت کی طرح صنعت و تجارت پر بھی چند افراد کی اجارہ داری ہوتی ہے اور صنعتی پیداوار بھی قدیم طریقوں کی وجہ سے محدود رہتی ہے۔ امیر اور غریب کے درمیان فرق اقتصادی اعتبار سے اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ غریب طبقہ اکثر حالات میں اپنی معاشی حالت بہتر بنانا خارج از امکان سمجھنے لگتا ہے اور تقدیر پر شاکر رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے برعکس امیر طبقہ کو جو وسائل حاصل ہوتے ہیں وہ ان وسائل پر اپنی گرفت مضبوط کرتا چلا جاتا ہے۔ اقدار حیات کے معاملہ میں بھی امیر اور غریب طبقہ کے مابین شدید فرق ہوتا ہے۔ امراء اور متمول افراد

جن باتوں پر نظری اعتبار سے غریب لوگوں کے ساتھ متفق ہوتے ہیں ان کے طرز عمل کے ساتھ ایسی باتوں کا سروکار تقریباً بالکل نہیں ہوتا۔ سیاسی قوت بھی امیر طبقہ کی دست نگر رہتی ہے۔

پاکستانی معاشرہ کچھ عرصہ قبل اور اب بھی اپنی بہت سی خصوصیات میں اسی قسم کا پسماندہ معاشرہ تھا اور ہے۔ ایسے معاشرہ میں تعلیم کا کام زیادہ تر تہذیبی اور ثقافتی نوعیت کا ہوتا ہے اور غریب افراد کی بہت بڑی اکثریت تعلیم کو اپنے حیطۂ اختیار سے باہر یا اپنے مقاصد زندگی کے لئے بے فائدہ تصور کرتی ہے اور زیادہ تر امیر افراد ہی تعلیم سے بہرہ ور ہونے کی فکر کرتے ہیں۔

اس قسم کے معاشرہ میں جب کوئی اقتصادی تغیر واقع ہونے لگتا ہے تو اس کی ابتدا میں تعلیم ہی کے بعض اثرات کارفرما ہوتے ہیں۔ مثلاً مختلف علوم کی ترقی سے پیدائش دولت کے جو نئے طریقے دریافت ہوتے ہیں، جب غریب افراد کی ایک قابل ذکر تعداد کو ان کا علم ہوتا ہے تو وہ اپنا معیار زندگی بلند کرنے کے ذرائع سوچنے لگتے ہیں۔ مثلاً ہم میں سے ہر ایک اس بات سے اتفاق کریگا کہ پاکستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات پیدائش دولت کے قدیم طریقوں سے پوری نہیں کی جاسکتیں۔ زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے ہمیں ہل کے بجائے ٹریکٹر، مصنوعی کھاد اور دوسرے جدید طریقوں کو اختیار کرنا پڑے گا۔ ہماری قدیم کھڈیاں ضرورت کا کپڑا تیار نہیں کرسکتیں۔ بڑی بڑی ملوں کا قیام اس مقصد کے لئے ضروری ہے۔ اسی طرح دوسری اشیاءِ ضرورت بھی بغیر جدید صنعتی ترقی کے اتنی تعداد میں نہیں پیدا کی جاسکتیں کہ لوگ عام طور پر خوشحال ہوسکیں۔

صنعتی معیشت کی جانب یہ قدم بعض ملکوں میں معاشرہ کے تعلیم یافتہ افراد کی تحریک پر اٹھایا جاتا ہے جیسا کہ برطانیہ اور امریکہ میں ہوا اور بعض ملکوں میں برسراقتدار طبقہ ایسے حالات پیدا کرتا ہے کہ پیدائش دولت کے جدید طریقوں کے استعمال سے زرعی اور صنعتی پیداوار میں اضافہ ہو جیسا کہ پاکستان میں ہورہا ہے۔ ان حالات کے پیدا کرنے میں تعلیم ایک نہایت اہم عامل کی حیثیت سے اثر انداز ہوتی ہے چونکہ تعلیم ہی کے ذریعہ لوگوں کو پیدائش دولت کے جدید طریقوں کا علم ہوتا ہے اور تعلیم ہی انہیں ایسے طریقوں کے استعمال کی تربیت دیتی ہے چنانچہ ایسے امیر افراد جو اپنے علاقہ کے اقتصادی وسائل پر پہلے سے اجارہ داری رکھتے ہیں اپنے علاقہ میں تعلیمی سہولتوں کے عام ہونے کی شدید مزاحمت کرتے ہیں اور اس بات سے خوف کھاتے ہیں کہ ان کے غریب مزارعین اور مزدور تعلیم یافتہ ہوکر اپنی غریبی پر قانع نہیں رہیں گے اور ان کی اطاعت و خدمت میں فرق واقع ہونے لگے گا۔

بہرحال ایک مرتبہ اگر کسی قوم کے جسم میں تعلیم کا انجکشن لگا دیا جائے تو اقتصادی ترقی کی راہ



میں حائل جراثیم مرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ ان تمام ملکوں میں جہاں تعلیم عام کی گئی اور اس کا معیار بلند ہوا، اقتصادی ترقی ہوکر رہی۔ جوں جوں عوام میں تعلیم پھیلنے لگتی ہے وہ ایک ایسے زمانے کا دھندلا سا خواب دیکھنے لگتے ہیں جب غربت غیر ضروری ہوجائے گی اور اشیاءِ ضرورت اس قدر وافر تعداد میں پیدا ہوں گی کہ ہر ایک کی بنیادی ضروریات زندگی آسانی سے پوری کی جاسکیں گی۔ لوگ مالی وسائل پس انداز کرکے صنعتوں میں لگاتے ہیں اور پیدائش دولت کی رفتار تیز ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد ایک وقت ایسا آتا ہے کہ مجموعی قومی آمدنی میں اضافہ کی رفتار آبادی میں اضافہ کی رفتار کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ ذرائع رسل و رسائل کی ترقی کے ساتھ صنعتی پیداوار میں اضافہ تجارت کی ترقی کا موجب بنتا ہے اور روزگار کے نئے نئے مواقع عوام کے لئے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ یہ صورت اگر استحکام کے ساتھ جاری رہے تو ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ہر قسم کی زرعی اور صنعتی پیداوار کے لئے بنیادی اہمیت کی صنعتیں ملک میں قائم ہوجاتی ہیں اور پیداوار میں اس قدر اضافہ ہوجاتا ہے کہ خوشحالی عام طور پر پھیلنے لگتی ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا اس قسم کی صنعتی ترقی کے لئے تعلیم ہی عوام کو بنیادی طور پر تیار کرتی ہے۔ اگر کسی قوم کی افرادی طاقت پیدائش دولت کے جدید طریقوں میں تربیت یافتہ ہو تو وہ قدرتی وسائل کی کمی پر بھی قابو پالیتی ہے۔ جرمنی اور جاپان دوسری جنگ عظیم میں تباہی کا ڈھیر ہوگئے تھے۔ مگر ان کے تربیت یافتہ شہریوں نے پندرہ بیس سال کے قلیل عرصہ میں انہیں اقتصادی ترقی کی اس منزل پر پہنچا دیا جن کا خواب وہ جنگ کی تباہ کاری سے پہلے دیکھتے تھے۔ اس کے برعکس ہمیں بھی آزاد ہوئے تقریباً اتنا ہی عرصہ گذرا ہے تعلیم کی کمی کی وجہ سے ہماری پسماندگی میں بہت تھوڑا فرق واقع ہوا ہے۔ اس لئے تعلیم کو آج کل انسانی وسائل میں سرمایہ کاری کا نام دیا جاتا ہے۔ جس طرح قدرتی وسائل مثلاً زمین، جنگلات، معدنیات وغیرہ میں سرمایہ لگاکر پیداوار بڑھائی جاسکتی ہے اسی طرح انسانی وسائل میں سرمایہ لگاکر منافع حاصل ہوسکتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم اور آمدنی کے تعلق کا تناسب ۹۰ سے ۹۵ فیصد تک پایا گیا یعنی جن افراد نے تعلیمی ترقی کی ان میں سے ۹۵ فی صد لوگوں کی آمدنی بھی بڑھتی گئی۔

اقتصادی ترقی کے تقاضوں کے تحت ہمارے ملک میں سائنس اور ٹیکنیکل تعلیم کی ضرورت روز بروز زیادہ شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔ بلکہ جہاں تک حصول معاش کا تعلق ہے فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، عربی، فارسی، اردو وغیرہ میں اعلیٰ تعلیم اتنی مفید ثابت نہیں ہوتی جتنی طب، انجینئرنگ اور دوسرے ٹیکنیکل شعبوں میں نفع بخش ہوتی ہے جو علوم کچھ عرصہ پہلے تک مہذب اور متمدن بننے کی خاطر پڑھے جاتے تھے آج ان کی تعلیم اکثر اوقات بے روزگاری کی طرف لے جاتی ہے اور جن ٹیکنیکل شعبوں

میں تربیت کی ضرورت صنعتی ترقی کی وجہ سے بڑھتی جا رہی ہے وہاں روزگار کے درخشاں مواقع بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ اب کسی طالب علم کو یہ کہہ کر شرم دلانا کہ تم محض پیسہ کمانے کی خاطر تعلیم حاصل کر رہے ہو چنداں موثر نہیں رہا۔

پاکستان میں دوسرے پنج سالہ منصوبہ کی کامیابی کے بعد صنعتی ترقی کا چکر گھومنے لگا ہے اور ہمارا ملک خاصی قابل ذکر رفتار سے زرعی اور صنعتی پیداوار میں اضافے کے لئے کوشاں ہے اس لئے حصول معاش کے طریقے بھی تیزی سے بدل رہے ہیں اور تعلیمی نظام میں مناسب تبدیلیوں کی ضرورت روز بروز شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ آئیے اب ان معاشرتی تبدیلیوں پر غور کریں جو اقتصادی ترقی کے ساتھ ہمارے ملک میں رونما ہو رہی ہیں۔

زراعت میں ٹریکٹروں اور دوسرے جدید آلات اور طریقوں کا استعمال رفتہ رفتہ زیادہ افراد کا اس پیشہ سے منسلک رہنا مشکل بنا دے گا۔ دس ایکڑ رقبہ کاشت کرنے کیلئے جہاں پہلے پانچ افراد کی ضرورت ہوتی تھی اب دو تین افراد ہی یہ کام بہتر طور پر انجام دینے کے لئے کافی ہوں گے۔ چنانچہ دیہات کی آبادی کچھ اس وجہ سے اور کچھ بعض دوسری وجوہ سے شہروں کا رخ کرے گی۔ پاکستان کی شہری آبادی میں اضافہ کی رفتار آج کل ۴ فیصد سالانہ ہے جب کہ کل آبادی تقریباً تین فی صد سالانہ کے حساب سے بڑھ رہی ہے۔ جو لوگ دیہات کے ماحول سے اٹھ کر شہروں میں سکونت اختیار کرتے ہیں معاشرتی اعتبار سے ان کی زندگی میں دور رس تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ کل وہ ایک ایسی آبادی میں رہتے تھے جہاں ہر شخص ایک دوسرے کو باقاعدہ جانتا تھا۔ مختلف روابط میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ منسلک تھے اور دیرینہ اخلاقی و معاشرتی اقدار کا حامل ماحول اس کی زندگی پر اثر انداز رہتا تھا آج انہوں نے کسی شہر کے محلہ میں کرایہ کا مکان لیکر رہنا شروع کیا اور ماحول اور ہمسایوں کی اجنبیت نے ان تمام اخلاقی اور معاشرتی اقدار کے بندھن ڈھیلے کرنے شروع کر دیئے جن کا پاس انہیں اس سے قبل خدا کے خوف کی وجہ سے نہیں تو خلق کی شرم کی وجہ سے ضرور ہوتا تھا۔ جوان بھائی بہنوں پر مشتمل بڑے بڑے کنبے جو دیہات اور قصبات میں ساتھ رہتے تھے اب چھوٹے چھوٹے خاندانوں کی شکل میں دور دراز مختلف مقامات پر بننے لگے جہاں انہیں حصول معاش کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔

پھر بدلتے ہوئے اقتصادی نظام میں کچھ لوگ اچانک امیر ہو گئے اور بے اندازہ سہولتیں اور مواقع جو انہیں یکایک مل گئے ان کے کردار میں غیر متوازن تبدیلیوں کا سبب بنے۔ ان حالات میں پاکستانی معاشرہ میں عام طور پر ایک ایسی فضا قائم ہوتی جا رہی ہے جس میں لوگ جہاں اقتصادی

(بقیہ بر صفحہ ۵۱)



اسرار احمد

# خطوط و نکات

## عجلت پسندی اور حبِّ عاجلہ

نظام آباد، ضلع گوجرانوالہ سے شیخ اللہ دتہ صاحب رقمطراز ہیں:

"...... "زندگی" رامپور کے شمارہ اکتوبر ۱۹۶۶ء صفحہ ۵۹ پر جناب عروج قادری صاحب نے آپ سے ایک شدید علمی غلطی "منسوب" کی تھی جس کی زد محترم مدیر "زندگی" کے بقول انبیاء کرام علیہم السلام بشمول جناب رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑتی ہے اور بجا طور پر آپ کو یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ آپ اپنی متعلقہ کتاب[1] کا وہ حصہ محترم مولانا امین احسن صاحب کو دکھا کر ان آیات کا حقیقی مفہوم سمجھ لیں۔

امید تھی کہ آپ "میثاق" کے ذریعہ کھلے دل سے اپنی غلطی (اگر واقعی غلطی ہو) کی اصلاح شائع کریں گے۔ مگر آج تک اس کے متعلق کچھ لکھنا آپ نے مناسب نہیں خیال کیا۔ اس سکوت کی آخر کیا توجیہہ کی جائے جبکہ معاملہ کی اہمیت کے پیش نظر قارئین "میثاق" بجا طور پر یہ توقع رکھتے تھے کہ آپ اولین فرصت میں اس کی وضاحت کر دیں گے اور اگر واقعی آپ سے سہو ہو گیا تھا تو کھلے دل سے اس کا اعتراف کر لیتے۔ یا بصورت دیگر مدیر "زندگی" کی غلط فہمی کا ازالہ کر دیتے۔

کیا اب یہ امید کی جا سکتی ہے کہ آپ اس پر روشنی ڈالیں گے۔؟......"

راقم الحروف شیخ صاحب موصوف کا شکر گزار ہے۔ کہ انہوں نے ایک ایسی بات اسے یاد کرا دی جو اس کے ذہن سے اتر گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ محترم مدیر "زندگی" کی مذکورہ تحریر پڑھ کر جب کتاب سے مراجعت کی گئی تو احساس ہوا تھا کہ واقعی تحریر میں ایک مقام پر ایسا ابہام پیدا ہو گیا ہے جس سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے چنانچہ اسی وقت یہ ارادہ کر لیا گیا تھا کہ اس کی وضاحت کر دی جائے گی۔ لیکن بعد ازاں

[1] تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ

یہ معاملہ ذہن سے بالکل اتر گیا۔

مدیر "زندگی" کے تبصرے کا متعلقہ حصہ حسب ذیل ہے۔

"جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے غالباً غیر شعوری طور پر یہ شدید علمی غلطی بھی ہوئی ہے کہ انہوں نے "عجلت پسندی" اور "حب عاجلہ" کے مترادف قرار دیا ہے وہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ اور كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ جیسی آیتوں کو ہم معنی و ہم مفہوم انہیں سمجھ رہے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہوں نے انبیائے کرام علیہم السلام تک کے بارے میں لکھ دیا ہے کہ کبھی کبھی وہ بھی حب عاجلہ سے مغلوب ہو جاتے تھے (نعوذ باللہ من ذالک) وہ لکھتے ہیں:-

لیکن اس حب عاجلہ کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ یہ بس کفار ہی میں ہوتی ہے مومن و مسلم کے پاس بھی نہیں پھٹکتی ایک شدید غلط فہمی ہے۔ مومن درحقیقت وہ ہوتا ہے جو شعوری طور پر دنیا پرستی (یعنی حب عاجلہ) کو چھوڑ کر آخرت پرستی (یعنی حب الآخرۃ) کو اختیار کرتا ہے۔ لیکن جب تک وہ انسان ہے اور بشری کمزوریاں اس کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، یہ بنیادی کمزوری (حب عاجلہ) وقتاً فوقتاً اپنا مظاہرہ کرتی رہتی ہے اور انسانی قلب و دماغ کو مسحور کر کے گناہ و عصیان اور خطا کی شکل میں رونما ہوتی رہتی ہے ـــــ بڑے سے بڑے انسان حتیٰ کہ پیغمبر تک اس کی گرفت سے بالکلیہ آزاد نہیں ہو سکے۔ صفحہ ۲۱۶

حیرت ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب جیسا ذہین آدمی "عجلت پسندی" اور "دنیا پرستی" کے درمیان فرق نہ کر سکا حالانکہ کوئی معقول آدمی ان دونوں کو ہم معنی و مترادف نہیں سمجھ سکتا۔ انہوں نے اپنی غلط فہمی کو اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن سیکھنے میں جو جلدی کرتے تھے وہ بھی ان کے نزدیک حب عاجلہ یعنی دنیا پرستی میں داخل ہو گئی ہے۔۔۔۔"

راقم الحروف محترم مدیر "زندگی" کا اس پر ممنون ہے کہ انہوں نے اس کی شدید علمی غلطی کی نشان دہی غالباً غیر شعوری طور پر نہ کہ رعایت آمیز الفاظ کے ساتھ کی۔ لیکن ساتھ ہی یہ عرض کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ اگر وہ پوری بحث کو غور سے پڑھتے تو اس حتمی نتیجے تک بھی پہنچ جاتے کہ کتاب کے مؤلف کے ذہن میں فی الواقع نہ تو یہ ہے کہ "عجلت پسندی" اور "حب عاجلہ" باہم مترادف اور ہم معنی ہیں اور نہ یہ کہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ اور كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ہم مفہوم آیات



ہیں صرف ایک مقام پر ایک لفظ ایسا غلط استعمال ہو گیا ہے جس سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ تاہم راقم الحروف مدیر "زندگی" کا شکر گزار ہے کہ ان کے توجہ دلانے سے غلطی کی نشاندہی ہو گئی۔

اس سلسلے میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی اس کی بنیاد یہ فقرہ ہے کہ:

"بڑے سے بڑے انسان حتیٰ کہ پیغمبر تک اس کی گرفت سے بالکلیہ آزاد نہیں ہو سکے۔"

اس فقرے میں "اس" سے مراد راقم الحروف کے ذہن میں تو عجلت پسندی تھی۔ یعنی ذہن میں اس کا مفہوم یہ تھا کہ "بڑے سے بڑے انسان حتیٰ کہ پیغمبر بھی عجلت پسندی کی گرفت سے بالکلیہ آزاد نہیں ہو سکے۔" لیکن عبارتِ ماسبق سے ربط کی بنا پر "اس" سے مراد "حب عاجلہ" بن گئی۔ کئی صفحات پر پھیلی ہوئی اس بحث میں کوئی اور مقام ایسا موجود نہیں ہے جو اشارۃً بھی اس پر دلالت کرتا ہو کہ مصنف کے ذہن میں یہ تصور موجود ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام بھی "حب عاجلہ" سے مغلوب ہو جاتے تھے۔ اس کے برعکس انبیائے کرام علیہم السلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے جو چند واقعات بطور استشہاد پیش کئے گئے ہیں ان میں صراحتہً "عجلت پسندی" مذکور ہے چنانچہ کتاب کی عبارت کا جو ٹکڑا محترم مدیر "زندگی" نے نقل فرمایا ہے اس کے فوراً بعد یہ الفاظ موجود ہیں کہ

"حضرت یونس علیہ السلام کی خطا جو کچھ بھی تھی اس کی بنیاد میں یہی "عجلت پسندی" کام کر رہی تھی۔"[1]

اس سے آگے جہاں حضرت ابن ام مکتوم کا واقعہ بیان ہوا ہے وہاں بھی الفاظ یہ ہیں کہ:

"پھر سورۂ عبس میں جس واقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ فرمائی گئی اس کی بنیاد میں بھی یہی عجلت پسندی کارفرما تھی۔۔۔۔"

کچھ اور آگے چل کر پھر یہ الفاظ آتے ہیں:

"دعوت حق کے دوران ایک غلطی جس کا امکان اسی عجلت پسندی کی سحر طرازیوں سے پیدا ہوتا ہے، یہ ہے کہ۔۔۔۔"

اور بحث کے آخر میں جہاں ان تمام واقعات پر ایک جامع تبصرہ ہے سو وہاں بھی الفاظ یہ ہیں کہ:

"ان تمام خطرات و خدشات اور بشری تقاضوں سے پیدا ہونے والی عجلت پسندی پر بروقت تنبیہ کرنے کے ساتھ۔۔۔۔"

اگر مصنف کے ذہن میں یہ تصور موجود ہوتا کہ عجلت پسندی اور حب عاجلہ باہم مترادف

[1] اگلے صفحے پر دیکھیں۔

ہیں اور (نعوذ باللہ من ذالک) انبیاء کرام علیہم السلام بھی حب عاجلہ سے مغلوب ہو جایا کرتے تھے۔ تو لازماً کسی مقام پر 'حب عاجلہ' کا لفظ بھی استعمال ہو جاتا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر محترم مدیر زندگی صرف واقعی غلطی کی نشاندہی پر اکتفا کرتے اور اس کی بنیاد پر ایک پوری تعمیر نہ کھڑی کر دیتے۔ رہا ان کا یہ فرمانا کہ

> "انھوں نے اپنی اس غلط فہمی کو اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن سیکھنے میں جو جلدی کرتے تھے وہ بھی ان کے نزدیک حب عاجلہ یعنی دنیا پرستی میں داخل ہو گئی ہے......"

تو یہ صریح زیادتی پر مبنی ہے اور اگرچہ ان کی یہ دیدہ ریزی قابل داد ہے کہ انھوں نے تلاش کر کے پوری بحث میں سے صرف اس مقام کو منتخب کیا جہاں 'عجلت پسندی' بصراحت مذکور نہیں ہے لیکن اولاً اس بنا پر کہ وہاں 'حب عاجلہ' کا تذکرہ بھی موجود نہیں ہے اور ثانیاً اس وجہ سے کہ اس سے قبل حضرت یونس علیہ السلام کے تذکرے میں "عجلت پسندی" صراحتہً مذکور ہو چکی ہے، ان کا یہ فیصلہ صادر کر دینا صریح دھاندلی ہے۔ !

> اصل یہ ہے کہ 'عجلت پسندی' اور 'حب عاجلہ' ایک ہی ڈور کے دو انتہائی سرے ہیں کہ "عجلت پسندی" انسان کی فطری کمزوریوں میں سے ہے اور اس سے بالکلیہ آزاد ہو جانا کسی انسان کے بس میں نہیں ہے اور قرآن مجید کے بیان کے مطابق انبیاء کرام علیہم السلام کی زندگی میں بھی ایسے مواقع آجاتے تھے جب بربنائے بشریت ان کا رجحان طبع عجلت پسندی کے جانب ہو جاتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنی خصوصی حفاظت سے انہیں اس میں مبتلا ہونے سے بچا لیتا تھا۔ ______ اس کے برعکس 'حب عاجلہ' کی کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب یہ بنیادی انسانی کمزوری عقل و شعور کے قابو سے نکل کر انسان پر غلبہ حاصل کر لے۔ نتیجۃً انسان کو دنیا ہی دنیا نظر آئے اور آخرت کا خیال دل سے محو ہو جائے۔ اس کیفیت کے انبیاء کرام علیہم السلام میں پیدا ہونے کا تصور بھی، کوئی مسلمان دائرہ اسلام میں رہتے ہوئے نہیں کر سکتا ______ !!

---

۱؎ یہ امر کسی قدر حیرانی کا موجب ہے کہ محترم مدیر زندگی نے راقم الحروف کی عبارت کو ٹھیک اس مقام پر ختم کیا جہاں 'غلطی' پورے جوبن پر نظر آتی تھی اور اگلے فقرے کو جو اس غلطی کی کسی قدر وضاحت کر رہا تھا کاٹ کر علیحدہ کر دیا۔



(۲)

# نقض غزل کے سلسلے میں ایک وضاحت

محترم صدیق الحسن گیلانی، سابق امیر جماعت اسلامی حلقہ راولپنڈی و حال انچارج شعبہ پارلیمانی امور مرکز جماعت اسلامی، اچھرہ، تحریر فرماتے ہیں:

آپ نے میثاق میں ایک سلسلہ مضامین شروع کیا ہے جس میں آپ نے دس بارہ سال پہلے کے کچھ واقعات بیان فرمائے ہیں۔ دسمبر ۱۹۷۶ء کے میثاق میں صفحہ ۳۸ پر میرا ذکر کیا ہے اور آپ نے لکھا ہے کہ ملک سعید صاحب کو بھی معطل کرنے کا ارادہ کیا گیا تھا لیکن ملک صاحب بہت ہوشیار آدمی تھے میرا ارادہ بھانپ کر پہلے ہی پریس کانفرنس کر کے مستعفی ہو گئے۔ اور جماعت پر سنگین الزامات لگائے ...... اصل واقعات یوں ہیں کہ میں نے ملک سعید صاحب کی رکنیت بہت پہلے معطل کر دی تھی حکیم عبدالرحیم اشرف وغیرہ کے معاملات بہت بعد میں پیش آئے ہیں۔ رکنیت سے معطلی کا فیصلہ اور چارج شیٹ ملک صاحب کی خدمت میں بھی ارسال کر دی تھی اور مرکزی دفتر کو بھی بھیج دی گئی تھی۔ محترم امیر جماعت نے مولانا عبدالغفار حسن صاحب اور محمد باقر خاں مرحوم پر مشتمل ایک ٹریبونل مقرر کر دیا تھا اس ٹریبونل نے چارج شیٹ کی ایک نقل ملک صاحب کو دوبارہ دی اور چند روز کی مہلت دے کر تاریخ مقرر کر دی تاکہ ملک صاحب چارج شیٹ کا جواب دے سکیں۔ جس تاریخ کو انہیں ٹریبونل کے سامنے پیش ہو کر جواب دہی کرنا تھا اسی روز انھوں نے پریس کانفرنس کر کے جماعت سے تعلق منقطع کر دیا۔

آپ کو اگر ایڈمنسٹریشن کا کچھ تجربہ ہوا ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بہت سی ضابطے کی کارروائیاں ہر ایڈمنسٹریشن چلانے والے آدمی کو کرنا پڑتی ہیں اور بسا اوقات اپنے دوستوں کے خلاف بھی کرنا پڑتی ہیں ضابطے کی کارروائیوں میں ذاتی رجحانات اور خیالات، دوستی اور مخالفت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ کارروائیاں علی الاعلان تمام کارکنوں کے سامنے ہوتی ہیں اور نظم بالا کو بھی ان پر غور کرنا ہوتا ہے۔ اگر بے جا کارروائی ہو تو خود کارروائی کرنے والا بھی مطعون ہوتا ہے۔ ایسی کارروائیوں کو بدنیتی پر مبنی قرار دینا میری ناقص رائے میں بہت بڑی زیادتی ہے۔ بلکہ ظلم عظیم ہے۔ میں نے ہمیشہ ضابطے کی ہر کارروائی اپنے ایمان و ضمیر کے مطابق کی ہے اور کبھی اپنے ذاتی رجحان کو کسی کارروائی کی بنا نہیں بنایا

یہ ملک صاحب کی صوابدید تھی کہ انہوں نے ٹریبونل کے سامنے پیش ہونے سے گریز کیا اور مستعفی ہو گئے۔"

"آپ ملک صاحب کو ذاتی طور پر مجھ سے یا مجھے ان سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی ہم دونوں نے قومی اسمبلی کا الیکشن مارشل لاء کے دور میں ۱۹۶۲ء لڑا تھا اور دوستانہ ماحول میں الیکشن کے کام کئے۔ مجھے صرف ۶۴ ووٹ ملے تھے اور انہیں صرف ۹ ووٹ مل سکے۔ شاید اس لئے کہ وہ الیکشن کو ناجائز سمجھ کر کام کر رہے تھے اور ناجائز ذرائع بھی اسی لئے استعمال کر رہے تھے۔"

مندرجہ بالا وضاحت اگرچہ زیادہ تر ایک اجمال کی تفصیل کی نوعیت کی ہے تاہم قارئین "میثاق" کی خدمت میں پیش ہے تاکہ وہ "نقش غزل" کے متعلقہ مقام کی تصحیح فرما لیں ——— رہی نیک نیتی اور بدنیتی کی بحث تو اس معاملے میں بقول "ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی" کی صورت بن جائے گی جہاں "حکمت عملی" کے خوشنما الفاظ کے پردے میں "(END JUSTIFIES MEANS)" کے نظریے کو جزو قانون بنایا گیا ہو، وہاں "نیت" کے مسئلے پر گفتگو محض وقت کا ضیاع ہے۔

"پس نوشت" میں گیلانی صاحب نے بلا ضرورت بے محل ملک سعید صاحب پر کیچڑ اچھال کر دل کی بھڑاس نکالنے کی جو کوشش فرمائی ہے وہ کسی طرح داعیانِ "اقامت دین" کے شایانِ شان نہیں ——— اس سلسلے میں اگر کوئی وضاحت ملک صاحب کرنا چاہیں تو "میثاق" کے صفحات حاضر ہیں!


## اعلان

مولانا حمید الدین فراہیؒ کی حسب ذیل تصانیف کے ترجمے ایک محدود تعداد میں وصول ہوئے ہیں قدردان حضرات رجوع فرمائیں۔ یہ ترجمے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے قلم سے ہیں اور دائرہ حمیدیہ اعظم گڑھ کے زیر اہتمام طبع ہوئے ہیں۔

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| مقدمہ تفسیر نظام القرآن | ۰.۹۰ | اقسام القرآن | ۱.۳۰ | ذبیح کون ہے؟ | ۱.۵۰ |
| تفسیر بسم اللہ و سورۂ فاتحہ | ۰.۲۵ | تفسیر سورۂ ذاریات | ۱.۳۰ | تفسیر سورۂ تحریم | ۰.۴۰ |
| تفسیر سورۂ قیامہ | ۰.۶۰ | تفسیر سورۂ مرسلات | ۰.۴۰ | تفسیر سورۂ عبس | ۰.۴۰ |
| تفسیر سورۂ والشمس | ۰.۵۰ | تفسیر سورۂ والتین | ۰.۴۰ | تفسیر سورۂ والعصر | ۰.۶۰ |
| تفسیر سورۂ فیل | ۱.۰۰ | تفسیر سورۂ کوثر | ۱.۰۰ | تفسیر سورۂ کافرون | ۰.۲۵ |
| تفسیر سورۂ لہب | ۰.۴۰ | تفسیر سورۂ اخلاص | ۰.۲۵ | | |

دار الاشاعت الاسلامیہ ——— امرت روڈ کرشن نگر لاہور




## تذکرہ و تبصرہ صفحہ ۱۶ سے آگے

یہ ہو گیا ہے کہ جو ذرا اس سطح سے بلند ہوتا ہے اس پر معیار زندگی کو بلند تر کرنے کی دھن سوار ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے نوجوانوں کا ملنا بظاہر محال نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا سعید روحوں سے کبھی خالی نہیں ہوتی، اور اگر کچھ مخلص و صاحب عزیمت لوگ ذہنی یکسوئی کے ساتھ اس کام کا بیڑا اٹھا لیں تو انشاء اللہ اسی معاشرے میں بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک نوجوان ایسے مل جائیں گے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک کو کہ خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ[لہ] اپنا لائحہ عمل بنا کر علم قرآن کی تحصیل و اشاعت کے لئے زندگی وقف کر دیں۔ —— یہ بھی واضح رہے کہ اصل ضرورت صرف اس کی ہوتی ہے کہ کسی جذبہ و خیال کے تحت انسان میں داخلی طور پر ایک داعیہ بیدار ہو جائے، پھر یہ داعیہ کام کی راہیں خود پیدا کر لیتا ہے اور تمام موانع و مشکلات سے خود نمٹ لیتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ اس خیال کو عام اور اس کی ضرورت کے احساس کو اجاگر کیا جائے پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس اعلیٰ و ارفع نصب العین کے لئے کام کرنے والے دستیاب نہ ہو سکیں۔

دوسرے یہ کہ ایک قرآنی اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا جائے —— جو ایک طرف علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت کا بندوبست کرے تاکہ قرآن کا نور عام ہو اور اس کی عظمت لوگوں پر آشکارا ہو اور دوسری طرف ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے جو بیک وقت علوم جدیدہ سے بھی بہرہ ور ہوں اور قرآن کے علم و حکمت سے بھی براہ راست آگاہ ہوں تاکہ متذکرہ بالا علمی کاموں کے لئے راہ ہموار ہو سکے۔

علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت کا اہم ترین نتیجہ یہ نکلے گا کہ عام لوگوں کی توجہات قرآن حکیم کے جانب مرکوز ہوں گی، ذہنوں پر اس کی عظمت کا نقش قائم ہوگا، دلوں میں اس کی محبت جاگزیں ہوگی اور اس کی جانب ایک عام التفات پیدا ہوگا، نتیجۃً بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان بھی اس سے متعارف ہوں گے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان میں سے ایک اچھی بھلی تعداد ایسے نوجوانوں کی نکل آئے جو اس کی قدر و قیمت سے اس درجہ آگاہ ہو جائیں کہ پوری زندگی کو اس کے علم و حکمت کی تحصیل و نشر و اشاعت کے لئے وقف کر دیں —— ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اس اکیڈمی کا اصل کام ہوگا اور اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ان کو پختہ بنیادوں پر عربی کی تعلیم دی جائے۔

لہ حدیث نبوی صلعم: "تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن کا علم حاصل کرتے اور اس کی اشاعت کرتے ہیں۔"

یہاں تک کہ ان میں زبان کا گہرا فہم اور اس کے ادب کا ستھرا ذوق پیدا ہو جائے۔ پھر انہیں پورا قرآن حکیم سبقاً سبقاً پڑھایا جائے اور ساتھ ہی حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم دی جائے —— پھر ان میں سے جو لوگ فلسفہ و الٰہیات کا ذوق رکھنے والے ہوں گے۔ ان کے لئے ممکن ہو گا کہ وہ قرآن حکیم کی روشنی میں جدید فلسفیانہ رجحانات پر مدلّل تنقید کریں، اور جدید علم الکلام کی بنیاد رکھیں —— اور جو عمرانیات کے مختلف شعبوں کا ذوق رکھنے والے ہوں گے۔ ان کے لئے ممکن ہو گا کہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے اسلام کی رہنمائی و ہدایت کو اعلیٰ علمی سطح پر پیش کر سکیں۔

خوش قسمتی سے قریبی زمانے میں برصغیر میں مولانا حمید الدین فراہیؒ ایسی شخصیت ہو گذری ہے جس نے اپنی پوری زندگی کو قرآن حکیم کے گہرے مطالعہ اور تدبر میں کھپا کر نہ صرف یہ کہ اس کے محل تدبر و تفکر ہونے کو اجاگر کیا بلکہ تدبر قرآن کے کچھ ایسے اصول بھی متعین کر دیئے جن کی روشنی میں قرآن حکیم پر غور و فکر کی راہیں آسان ہو جاتی ہیں —— پھر یہ بھی اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ اگرچہ ان کے تلمیذ رشید یعنی مولانا امین احسن اصلاحی کی زندگی کا بہت سا حصہ کچھ دوسرے کاموں کی نذر ہو گیا اور عمر کے اس حصے میں جبکہ قویٰ پر ویسے بھی اضمحلال طاری ہونا شروع ہو جاتا ہے، انہیں پیہم کئی ایسے صدموں سے دوچار ہونا پڑا جن سے اچھے اچھے جوانمردوں کی کمر ہمت بھی ٹوٹ کر رہ جاتی ہے تاہم انھوں نے اپنی قوتوں کو از سر نو مجتمع کر کے ایک طرف تفسیر تدبر قرآن کی تحریر کا کام شروع کر دیا جس سے نہ صرف یہ کہ خود ان کے اور ان کے استاذ امام فراہیؒ کے زندگی بھر کے مطالعے اور غور و فکر کے ماحصل کے محفوظ ہونے کی صورت پیدا ہو سکے گی بلکہ قرآن پر تدبر کا ذوق بھی مزید راسخ ہو جائے گا اور اس کام کو آگے بڑھانا ممکن ہو سکے گا —— اور دوسری طرف کچھ ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا کام بھی شروع کر دیا جو کالجوں سے فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ گویا جدید دنیا سے کسی قدر باخبر و سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے ایک حد تک بہرہ ور ہو چکے تھے، اور انہیں عربی زبان کی تعلیم اس حد تک دے کر کہ ان میں ادب کا ذوق پیدا ہو جائے۔ انہیں پورے قرآن حکیم کا درس بھی دیا اور کتب حدیث میں سے صحیح مسلمؒ بھی پڑھائی —— اور اس طرح ایک چھوٹے سے پیمانے پر حلقہ تدبر قرآن کی بنیاد رکھ دی ——!

اب اگر کچھ باہمت لوگ میدان میں آ جائیں اور اس کام کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں تو یہی حلقہ تدبر قرآن ایک ایسے مرکزے (NUCLEUS) کی صورت اختیار کر سکتا ہے جس کے ارد گرد ایک قرآنی اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا جا سکے —— اور کالجوں اور یونیورسٹیوں سے فلسفہ و نفسیات،



ریاضی و طبیعات اور عمرانیات کے مختلف شعبوں یعنی سیاسیات اور معاشیات وغیرہ کے فارغ التحصیل نوجوان قرآن حکیم کے نور سے اپنے قلوب و اذہان کو منور کر کے اپنے اپنے شعبۂ علم میں قرآن کی حکمت و معرفت اور ہدایت و رہنمائی کو خالص علمی انداز میں بنی نوع انسان کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہو سکیں —— اور اس طرح اس علمی انقلاب کی راہ ہموار ہو سکے جس سے مادہ پرستی اور الحاد کی جڑیں کٹ جائیں اور خدا پرستی و خود شناسی کی دولت عام ہو جائے ——! اس کے بعد ہی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے خواب کے شرمندہ تعبیر ہونے کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔

---

دعوت ہائے استقبالیہ اور سپاسناموں نے موجودہ زمانے میں میدانِ سیاست کی ایک عام اور معروف سرگرمی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ لیکن ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اپنی مخصوص ہیئت و ترکیب کے اعتبار سے ان کے اور اسلام کے مزاج کے مابین بہت بُعد ہے ان کے بنیادی فلسفے کو لیجئے تو اس میں لیڈر پرستی ایک جزو لاینفک کے طور پر موجود نظر آئے گی —— اور شکل و صورت کے اعتبار سے دیکھئے تو ایک شخص کو مجمع عام میں سامنے بٹھا کر اس کی تعریف کے گن گانا، اس کے اوصاف حمیدہ کا تذکرہ کرنا اور اس کی ملک و ملت یا دین و مذہب کی خدمات کو سراہنا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ہدایات کے صریحاً خلاف ہے جن میں آپؐ نے کسی شخص کی اس کے منہ پر تعریف کرنے سے شدت کے ساتھ منع فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک اس سرگرمی نے دینی حلقوں میں بار نہ پایا تھا۔ لیکن ادھر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دفعتاً اس بیماری نے ایک وبا کی صورت میں خالص دینی حلقوں میں سرایت کرنا شروع کر دیا ہے۔ جماعت اسلامی کے بارے میں تو چونکہ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ وہ سیاسی زیادہ ہے یا مذہبی لہٰذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس کے حلقے میں اس کا رواج ایک عرصے سے ہو چکا ہے اور اب یہ بیماری اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ ان کے ہفت روزوں کی پوری کی پوری اشاعتیں صرف مولانا مودودی کی خدمت میں پیش ہونے والے سپاسناموں سے بھری ہوتی ہیں —— لیکن افسوس اس پر ہے کہ یہ بدعت خالص دینی و مذہبی حلقوں میں بھی داخل ہو رہی ہے خصوصاً جب یہ سننے میں آیا کہ مولانا عبید اللہ انور صاحب نے ایک مقامی ہوٹل میں مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا تو اس خیال سے بڑا دکھ ہوا کہ کیا ہمارے ایسے ثقہ دینی حلقے بھی جدید طور طریقوں سے اس درجہ مرعوب ہو گئے ہیں کہ اب انہیں ان کی نقالی کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا؟ اس معاملے کا مزید تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ یہ استقبالیہ دعوتیں بالعموم ایسے ہوٹلوں میں منعقد ہوتی ہیں جو

جدید تہذیب و ثقافت کی ان تمام برائیوں کا مظاہرہ ہیں جن کا رونا ہر منبر پر اور ہر دینی جریدے میں بڑے سوز اور درد کے ساتھ رویا جا رہا ہے۔

ہم علماء کرام کی خدمت میں دست بستہ گذارش کرتے ہیں کہ وہ اس معاملے پر سنجیدگی سے غور فرمائیں ابھی دینی حلقوں میں اس بدعت کی ابتدا ہو رہی ہے اگر اسی مرحلے پر اسے روک لیا جائے تو یہ سلسلہ رک جائے گا۔ ورنہ اکابر کے دیکھا دیکھی اصاغر بھی اس میں مبتلا ہوتے چلے جائیں گے۔ اور پھر اس کا روکنا ممکن نہ رہے گا ـــــ !!

---

تدبر قرآن کی جلد اوّل کی طباعت میں یقیناً غیر معمولی تاخیر واقع ہو گئی ہے۔ جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں چونکہ بہت سے خطوط میں اس کے بارے میں پوچھا جاتا ہے لہٰذا اطلاعاً عرض ہے کہ اس کی تصحیح ثانی کا کام بھی تقریباً مکمل ہو چکا ہے اور اب انشاء اللہ جلد ہی اس کی طباعت کا مرحلہ شروع ہو جائے گا اس تاخیر کی بنا پر اس کے قدردانوں کو انتظار کی جو کوفت برداشت کرنی پڑتی ہے اس کے لئے ہم دوبارہ معذرت طلب کرتے ہیں۔

---

ترقی کے لئے دیوانہ وار کوشش کر رہے ہیں وہاں ذہنی سکون اور اخلاقی استحکام میں کمزوری پیدا ہو جانے کے باعث نئے حالات سے ہرگز مطمئن نہیں اور عام طور پر یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کی اصلاح جلد کی جائے ورنہ خدا معلوم معاشرہ کا کیا حشر ہو گا۔

تعلیم سے بجا طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں اخلاقی اور معاشرتی استحکام پیدا کرنے کا نہایت اہم رول ادا کرے گی۔ لیکن ماہرین تعلیم اب تک تعلیمی مقاصد اور معاشرتی مقاصد میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اس لئے تعلیم کا یہ رول چنداں مؤثر ثابت نہیں ہو رہا۔ طلبہ جب معاشرہ میں اکثر لوگوں کو ہر ممکن طریقے سے دولت کمانے میں سرگرداں دیکھتے ہیں تو اسکول میں حلال و حرام کی تمیز اگر بالفرض انہیں سکھائی بھی جائے تو چنداں مؤثر نظر نہیں آتی۔ پہلے ہم یہ طے کریں کہ ایک پاکستانی شہری کا کردار عملاً کیا ہونا چاہیئے۔ پھر مقاصد تعلیم کو متعین کیا جائے اور ان کے حصول کی کوششیں کی جائیں۔ یہ کام مزید پیچیدہ اور مشکل ہو جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں۔ کہ پاکستانی شہری کے مطلوبہ کردار کا تصور جو امیر طبقہ لئے ہوئے ہے متوسط طبقہ اور غریب طبقہ کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ چنانچہ یہ طبقہ اپنے بچوں کو عام اسکولوں میں نہیں بھیج سکتا بلکہ ان کے لئے پبلک اسکول اور ماڈل اسکول قائم کرتا ہے۔

---


## ہم سے طلب فرمائیے

★

### تصانیف
### مولانا امین احسن اصلاحی

★

**تفسیر آیت بسم اللہ و سورہ فاتحہ**

بڑا سائز، صفحات: ۳۶
ہدیہ: ۵۵ پیسے

★

**دعوت دین اور اس کا طریق کار**

صفحات: ۳۱۲، قیمت: ۳.۷۵ روپے

★

**تزکیہ نفس**

صفحات: ۳۳۳، قیمت: ۶.۰۰ روپے

★

**اسلامی قانون کی تدوین**

صفحات: ۱۶۰، قیمت: ۳ روپے
سستا ایڈیشن: ۲ روپے

★

**عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ**

صفحات: ۱۲۸، قیمت: ۲.۲۵ روپے

★

### تصانیف
### مولانا حمید الدین فراہی رحمہ

★

**مفردات القرآن**

قیمت: ۱.۳۰ روپے

★

**جمہرة البلاغہ**

قیمت: ۱.۵۰ روپے

★

**اسباق النحو**

حصہ اول: ۱.۳۰ روپے
حصہ دوم: ۱.۰۰ روپے

★

**امثال آصف الحکیم**

قیمت: ۱.۳۵ روپے

| | | |
|---|---|---|
| حضرت عائشہ صدیقہ رضہ | سلام اللہ صدیقی جونپوری | ۱۰.۰۰ روپیہ |
| حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضہ | " " " | ۱۳.۰۰ " |
| تاجدار مدینہ کی شہزادیاں | " " " | ۱.۱۵ " |
| حضرت عمرو بن العاص | " " " | ۲.۹۰ " |
| اھلبیت اور اھلسنت | محمد سراج الحق مچھلی شہری | ۱.۱۵ " |
| اسلامی حکومت کے نقش و نگر | مولانا ظفیر الدین مفتاحی | ۲.۰۰ " |
| تحفۂ کربلا | محمد احمد الہ آبادی | ۰.۵۰ " |
| مولانا مودودی اور سیدنا عثمان غنی رضہ | محمد سراج الحق مچھلی شہری | ۲.۳۰ " |